Women Writers'
Classics

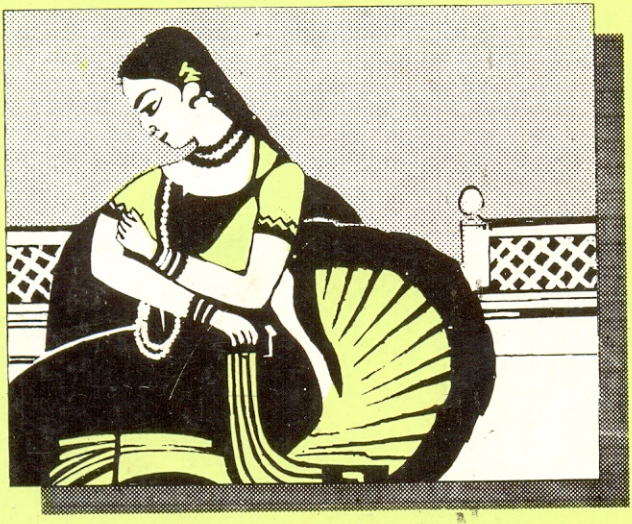

افسانے

اپنے اپنے چھید

امرتا پریتم

RHOTAS LPS
Low Priced Series

اپنے اپنے چھید

افسانے

امرتا پریتم

روہتاس بکس

جملہ حقوق محفوظ

اشاعت اول	۱۹۹۲ء
پرنٹرز	نفیس پرنٹرز پیالہ گراؤنڈ لاہور
پبلشرز	روہتاس بکس احمد چیمبرز - ٹیمپل روڈ لاہور

Rs. 15/=

اپنے اپنے چھید

ترتیب

کرماں والی 5

مٹی کی ذات 13

اجنبی 19

عمارت ساز 26

مونالیز نمبر 2 34

اپنے اپنے چھید 51

رام جی کے کنویں کی بوکی 58

ایک لڑکی ایک جام 65

لال مرچ 72

کرماں والی

تندوری روٹی بہت ہی عمدہ بنی تھی، مگر اس کو سبزی کے ساتھ ملا کر کھانا دشوار تھا۔

"اتنی تیز مرچ!" میں اور میرے دونوں بچے سی سی کرنے لگے تھے۔

"بی بی! یہاں جاٹوں کی آمدورفت بہت ہے۔ کوسوں میں شراب کی بس یہی ایک دکان ہے۔ جاٹ جب گھونٹ بھر لیتے ہیں تو اچھی مصالحہ دار سبزی مانگتے ہیں" تندور والا کہہ رہا تھا۔

"یہاں---- جاٹ---- شراب----!"

"ہاں بی بی! شراب تو سبھی پیتے ہیں لیکن جاٹ جب کسی کا خون کر کے آتے ہیں تو کچھ زیادہ ہی پیتے ہیں۔"

"یہاں ایسے واقعات----"

"ابھی تو پرسوں ترسوں کوئی پانچ چھ آگئے۔ ایک آدمی کو مار کر آئے تھے۔ ان لوگوں نے خوب چڑھا رکھی تھی، مگر شرارتیں کرنے لگے۔ وہ دیکھو، میری تین کرسیاں ٹوٹی پڑی ہیں۔ پرماتما بھلا کرے پولیس والوں کا، وہ سب انہیں جلدی پکڑ کر لے گئے۔ نہیں تو میرے چولہے کی ایک اینٹ بھی نہ ملتی---- لیکن ہم کمائی بھی تو انہیں کی کھاتے ہیں----"

مجھے اس روز کوشلیا ندی دیکھنے کی خواہش چندی گڑھ سے اس گاؤں میں لے گئی تھی۔ بات مرچوں سے آگے بڑھ کر شراب تک پہنچی اور پھر خون خرابے تک پہنچ گئی تھی۔ میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر اس گاؤں سے جلد سے جلد لوٹنے

کے لئے بے قرار ہو اٹھی۔

تندور اچھی طرح لپا تپا تھا اور اندر سے کھلا ہوا تھا۔ اندر ایک طرف کوئی چھ سات خالی بوریوں کو تان کر پردہ لگا تھا۔ اس کے پیچھے پڑی ہوئی تین چارپائیوں کے پائے بتاتے تھے۔ کہ تندور والے کے بال بچے بھی یہیں رہتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے خطرے کا احساس کچھ کم ہوا کیونکہ وہاں عورت کا قیام تھا اور عزت محفوظ تھی۔

کسی عورت نے ٹاٹ ہٹا کر باہر جھانکا اور پھر وہ میرے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

"بی بی! تو نے مجھے پہچانا؟"

"نہیں تو-----"

وہ ایک سیدھی سی جوان عورت تھی۔ میں دیر تک اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی، لیکن مجھے کوئی بھی بھولی بسری بات یاد نہ آئی۔

"میں نے تو تجھے پہچان لیا ہے بی بی! پچھلے سال---- نہیں اس سے بھی پچھلے سال تو یہاں آئی تھی نا؟"

"ہاں، میں آئی تو تھی!"

"سامنے میدان میں ایک بارات اتری تھی۔"

"ہاں، مجھے یاد ہے۔"

"وہاں تو نے ڈولی میں بیٹھے ہوئے مجھ کو روپیہ دیا تھا!"

بات یاد آگئی۔ دو سال قبل میں چندی گڑھ گئی تھی۔ وہاں نئے ریڈیو اسٹیشن کا افتتاح ہونے والا تھا۔ پہلے دن کے افتتاحیہ پروگرام کے لئے میرے دلی کے دفتر نے مجھے وہاں ایک نظم پڑھنے کے لئے بھیجا تھا۔ من موہن سنگھ اور ہندی کے ایک شاعر جالندھر اسٹیشن کی طرف سے آئے تھے۔ پروگرام جلد ہی ختم ہوگیا تھا اور ہم چار ادیب کوشلیا ندی کو دیکھنے کے لئے چندی گڑھ سے اس گاؤں میں آئے تھے۔

ندی کوئی میل ڈیڑھ میل ڈھلوان پر تھی۔ واپس لوٹتے وقت ہم سب چائے کے ایک گرم پیالے کے لئے ترس گئے تھے۔ سب سے صاف اور کھلی دکان یہی نظر

آئی تھی۔ یہیں ہم لوگوں نے چائے کا ایک ایک گرم پیالہ پیا تھا۔ اس روز اس دکان پر تیار ہوتے ہوئے گوشت اور تندوری روٹیوں کے ساتھ ساتھ کافی مٹھائیاں بھی تھیں۔

تندور والے نے بتایا تھا۔

"آج یہاں سے میری بھانجی کی ڈولی گزرے گی میرا بھی تو کچھ فرض ہے نا"

اور پھر سامنے میدان میں ڈولی اتری۔ ڈولی کسی پچھلے گاؤں سے آئی تھی۔ اسے ابھی اور آگے جانا تھا۔ راستے میں "ماما" نے استقبال کیا تھا۔

"شادی بھی عجیب شے ہے۔ آتے وقت کیسا رنگ لاتی ہے اور جاتے وقت----" ہم میں سے ایک نے کہا تھا اور پھر چائے کی چسکیوں کے ساتھ رنگ کا فلسفہ بھی گرم ہوتا گیا تھا۔

"ٹھہرو، میں نئی دلہن کا منہ دیکھ آؤں! دیکھوں تو آج اس کے منہ پر کیا رنگ ہے۔" مجھے یاد ہے، میں نے کہا تھا۔ اس پر میرے ساتھیوں نے جواب دیا تھا!

"ہمیں تو کوئی ڈولی کے پاس پھٹکنے بھی نہیں دے گا، تم ہی دیکھ آؤ---- لیکن خالی ہاتھ نہ دیکھنا!"

میں ایک مسکراہٹ لئے ڈولی کے پاس چلی گئی تھی۔ ڈولی کا پردہ ایک طرف سے اٹھا ہوا تھا۔ میں نے قریب ہی بیٹھی نائن سے پوچھا تھا! "میں دلہن کا منہ دیکھ لوں؟"

"بی بی جی صدقے!---- دیکھ ہماری لڑکی تو ہاتھ لگائے میلی ہوتی ہے۔"

"اور سچ مچ لڑکی کے چہرے پر مقدس مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اس کا مقابلہ آسان نہیں تھا۔"

میں نے ایک روپیہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور جب لوٹی تو میرے ایک ساتھی نے کہا تھا۔ "کچھ دیر قبل جب تم نے اپنی نظم پڑھی تھی تو کالج کی کتنی ہی لڑکیوں نے روپے کے نوٹ پر تم سے دستخط کروائے تھے، مگر اس بے چاری کو کیا خبر کہ یہ روپیہ کس نے دیا ہے۔ جانتی ہوتی تو تم سے دستخط بھی کرالیتی۔"

یہ دو سال پہلے کی بات تھی' مجھے پوری کی پوری یاد آگئی۔

"تم ہی وہ ڈولی والی لڑکی ہو؟"

"ہاں بی بی!"

نہ جانے کس حادثے نے اسے دو ہی سال کے عرصے میں لڑکی سے عورت بنا دیا تھا! حادثے کے نشانات اس کے چہرے پر نمایاں تھے پھر بھی مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں کیسے دریافت کروں۔

"بی بی! میں نے تیری تصویریں اخبار میں دیکھی تھی۔ ایک بار نہیں دوبار ---- یہاں بھی کتنے لوگ تے ہیں جن کے پاس اخبار رہتا ہے۔ کئی تو روٹی کھاتے کھاتے یہیں پر چھوڑ جاتے ہیں۔"

"سچ! اور تو نے میری تصویر پہچان لی تھی؟"

"میں نے اسی وقت پہچان لی تھی---- لیکن بی بی! وہ لوگ تیری تصویر کیوں چاپتے ہیں؟"

مجھے جلدی میں کوئی جواب نہ بن پڑا۔ مجھ سے ایسا سوال پہلے کبھی کسی نے نہیں پوچھا تھا۔ کچھ ندامت کے ساتھ میں نے کہا۔ "میں کہانیاں اور نظمیں لکھتی ہوں نا!"

"کہانیاں! بی بی' وہ سب کہانیاں سچی ہوتی ہیں یا جھوٹی؟"

"کہانیاں تو سچی ہوتی ہیں۔ ویسے نام غلط ہوتے ہیں' تاکہ پہچانے نہ جانیں۔"

"تو میری کہانی بھی لکھ سکتی ہے بی بی؟"

"اگر تو کہے تو میں ضرور لکھوں گی۔"

"میرا نام کرماں والی (قسمت والی) ہے تو چاہے تو میرا نام بھی غلط نہ لکھنا۔ میں کوئی جھوٹ تھوڑے ہی بولوں گی۔ میں تو سچ کہتی ہوں۔ لیکن کوئی میری سنے بھی تو۔ کوئی نہیں سنتا؟"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ٹاٹ کے پیچھے پڑی ہوئی چارپائی پر لے گئی۔

"جب میری شادی ہونے والی تھی نا' تو میری سسرال سے دو جنی میرا ناپ

لینے آتی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی میری ہی عمر کی تھی' بالکل میرے ہی برابر۔ وہ کسی دور کے رشتے سے میری نند لگتی تھی' میری شلوار قمیض ناپ کر کہنے لگی۔ "بالکل میرا ہی ناپ ہے بھابی! تو فکر نہ کر' جو کپڑے سیئوں گی' تجھے ایک دم پورے آئیں گے!"

اور سچ مچ شادی کے جتنے بھی کپڑے تھے' مجھے خوب اچھی طرح آتے تھے' وہی نند کئی مہینے تک میرے پاس رہی اور بعد میں بھی میرے کپڑے وہی سیتی رہی' وہ مجھے چاہتی بھی بہت تھی۔ مجھ سے کہا کرتی! "بھابی! چاہے میں دو مہینے بعد آؤں' چاہے چھ مہینے بعد' لیکن تو کسی اور سے کپڑا مت سلوانا۔"

وہ مجھے بھی بہت اچھی لگتی تھی!

اس کی طرف ایک بات مجھے ناپسند تھی۔ وہ میرا جو بھی کپڑا سیا کرتی تھی' پہلے خود پہن کر دیکھتی تھی۔ کہتی! "تیرا میرا ایک ہی ناپ ہے---- دیکھ مجھے کیسا پورا آتا ہے تجھے بھی پورا آئے گا---- اور سارے کپڑے پہنتے وقت میرے دل میں آتا تھا۔ کپڑے بھلے ہی ہیں۔ لیکن ہیں تو اسی کے اتارے ہوئے نا!"

رسی کے ساتھ ٹنگا ہوا ٹاٹ کا پردہ تھا۔ بان کی ڈھیلی سی چارپائی تھی۔ کھیس بھی خستہ تھا۔ یہ لڑکی بھی الٹرا اور گنوار تھی۔ مگر یہ خیال کتنا نازک' کتنا لطیف تھا!---- میں چونک پڑی۔

"لیکن بی بی! میں نے اپنے من کی بات کبھی نہیں کہی۔ جانے بے چاری کا من چھوٹا ہو جائے!"

"پھر؟"

"پھر مجھے کوئی ڈیڑھ برس بعد پتہ چلا۔ کسی نے بتا دیا تھا۔ اس کی اور گھر والے کی لگی ہوئی تھی۔ یہ اس کا دور کے رشتے سے بھائی لگتا تھا۔ لیکن اس کے سگے بھائی کو یہ بات بہت بری لگتی تھی۔ وہ تو ایک بار---- اپنی بہن کی گردن اتارنے کو بھی تیار ہو گیا تھا!----"

کسی نے مجھے یہ بھی بتا دیا تھا کہ جب اس نے بہن بن کر گھوڑے کی باگ

پکڑی تھی تو اسے عشق آگیا تھا۔

آنسوؤں سے بھیگی کرماں والی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بی بی! تو میرے من کی بات سمجھ لے۔ مجھ سے اترن نہیں پہنا جاتا۔ میری گوٹے دار شلواریں' میری تاروں جڑی چوڑیاں اور میری سلموں والی قمیض---- سب کچھ اسی کے اترن تھے اور میرے کپڑوں ہی کی طرح میرا گھر والا بھی----"

کرماں والی کی بات کے آگے میرا قلم جھک گیا۔ کون ادیب ایسا فقرہ لکھ سکتا تھا!

"اب بی بی میں وہ سارے کپڑے اتار آئی ہوں۔ اپنے گھر والوں کو بھی یہاں' ماما جی کے پاس آگئی ہوں۔ ان کا گھر صاف کرتی ہوں' میزیں دھوتی ہوں اور میں نے ایک مشین بھی خرید لی ہے' چار کپڑے سی لیتی ہوں اور گزارہ ہو جاتا ہے بھلے ہی کھدر ملے چاہے لٹھا۔ مگر میں کسی کا اترن نہیں پہنتی---- میرا ماما صلح کرانے کو پھر رہا ہے۔ وہ میرے دل کی بات نہیں سمجھا۔ میں جس طرح جی رہی ہوں' اسی طرح جی لوں گی۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی---- بی بی! تو صرف ایک بار میرے من کی بات لکھ دے!"

کرماں والی کے جس جسم کے ساتھ یہ کہانی پیش آئی تھی' اسے میں نے ایک بار پوری طاقت سے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔ کتنا توانا جسم تھا اور کتنا مضبوط دل!

یہاں میں پل بھر پہلے مرچوں سے شراب اور شراب سے خون خرابے تک آئی ہوئی گفتگو سے گھبرا گئی تھی اور یہیں پر یہ کرماں والی کتنی دلیری سے زندگی کے دن گزار رہی تھی۔

باہر سڑک پر شملہ سے آنے والی موٹریں گزرتی تھیں۔ ان کی سواریاں ریشمی کپڑوں میں ملبوس کئی بار لمحہ بھر کے لئے اس دکان پر چائے کے ایک پیالے کے لئے یا سگریٹ کی ایک ڈبیہ کے لئے یا گرم تندوری روٹی کیلئے رک جاتی تھیں---- ان کے جسم کے ریشمی کپڑے نہ جانے کس کس کے اترن ہوتے تھے!

اور کرماں والی ان کی میزیں صاف کرتی تھی، کرتیں جھاڑتی تھی۔ وہی کرماں والی، جس نے ایک کھدر کی قمیض پہن رکھی تھی اور جو اپنے جسم پر کسی کا اترن نہیں پہن سکتی تھی!

"بی بی! میں نے تیرا وہ روپیہ اب تک سنبھال رکھا ہے۔"

"کیا سچ! اب تک؟"

"ہاں، بی بی! اس وقت وہ روپیہ میں نے اپنی نائن کو تھما دیا تھا اور پھر دوسرے ہی دن کی بات ہے جب میں نے تیری تصویر دیکھی۔ میں نے نائن سے وہ روپیہ لے کر حفاظت سے رکھ لیا تھا۔ بی بی! تو اس روپے پر اپنا نام لکھ دے۔ پھر جب تو میری کہانی لکھنا تو مجھے ضرور بھیجنا!"

اور کرماں والی نے اٹھ کر چارپائی کے نیچے رکھا ہوا ٹرنک کھولا۔ ٹرنک میں ایک لکڑی کی صندوقچی تھی۔ اس میں سے اس نے تہہ کیا ہوا وہ نوٹ نکالا۔

"میں اپنا نام تو لکھ دیتی ہوں کرماں والئے!---- میں نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کے نوٹوں پر اپنا نام لکھا ہوگا۔ لیکن آج میرا جی چاہتا ہے کہ تو میرے نوٹ پر اپنا نام لکھ دے!---- کہانی کا ربڑا نہیں ہوتا۔ بڑا تو وہ ہے جس نے کہانی خود اپنے جسم پر جھیلی ہے۔"

"مجھے تو اچھی طرح لکھنا بھی نہیں آتا" کرماں والی شرما سی گئی اور پھر بولی۔

"بی بی! تو میرا نام کہانی میں ضرور لکھنا!"

"ہاں میں وہی نام، تیرے ہاتھوں کا لکھا ہوا تیرا ہی نام اس کہانی کا عنوان رکھوں گی۔"

میں نے پرس سے نوٹ اور قلم نکالا۔

کرماں والیے! آج میں تیری کہانی لکھ رہی ہوں۔ وہی، روپے کے نوٹ پر لکھا ہوا تیرا نام آج اس کہانی کی پیشانی پر مقدس ٹیکے کی مانند جگمگا رہا ہے۔

یہ کہانی تیرا کچھ نہیں سنوارے گی---- لیکن یہ یقین رکھنا کہ وہ دل بھی تیرے اس ٹیکے کو سلام کرتے ہیں جن کے خون کا رنگ تیرے اس ٹیکے کے رنگ

سے ملتا ہے---- اور وہ سر بھی شرم سے اس کے آگے جھکتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے جسموں پر نہ جانے کس کس کے اترن پہن رکھے ہیں!!

مٹی کی ذات

چھبیلی نائن نے اپنے کچے چبوترے پر ایک پتھر رکھ چھوڑا تھا۔ اس پتھر پر بیٹھ کر وہ برتن بھی مانجھ لیتی، کپڑے بھی دھو لیتی۔ اپنی ایڑیاں بھی رگڑ لیتی اور جب ترکاری ساگ کاٹتے وقت چاقو کند محسوس ہوتا تو اسی پتھری پر رگڑ کر تیز کر لیتی۔

اپنے چبوترے کے پتھر کی مانند چھبیلی نے بھی اپنے دل میں متعدد درد چھپا رکھے تھے۔ برسوں سے اپنی زندگی کے جھوٹے دنوں کو مانجھ رہی تھی۔ میلی سانسوں کو دھو رہی تھی۔ محبت کی پھٹی ہوئی ایڑیاں رگڑ رہی تھی اور اپنی شادی کے کند چاقو کو رگڑ رگڑ کر تیز کر رہی تھی۔

گاؤں والوں کا کہنا ہے چھبیلی کو اپنی بھری جوانی میں ایک راس لیلا کرنے والے سے محبت ہوگئی تھی۔ وہ مہینوں تک کسی سیتا کا رام بن سکتا تھا۔ کسی دمینتی کا نل بن سکتا تھا۔ یا کسی کوکیلا کا رسالو بن سکتا تھا۔ لیکن وہ چند لمحوں کیلئے بھی چھبیلی کا کچھ نہ بن سکا۔ کیونکہ "سیتا رام" کا ناٹک کھیلنے کے بعد "نل دمینتی" کا ناٹک کھیلا جا سکتا ہے۔ "کوکیلا رسالو" کا ناٹک کھیلا جا سکتا ہے۔ غرض کہ کوئی بھی ناٹک کھیلا جاسکتا ہے۔ لیکن بیاہ کا ناٹک کھیلنے کے بعد پھر زندگی میں کوئی ناٹک نہیں کھیلا جا سکتا جو براتی اس ناٹک کے تماش بین بن کر آتے ہیں وہ ایک مرد عورت کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ دل کھول کر تالیاں بجاتے ہیں اور پھر اس ناٹک کے مرکزی کرداروں کو وہیں چھوڑ کر پنڈال خالی کر جاتے ہیں اور اس ناٹک کے دونوں مرکزی کرداروں کو تمام عمر وہی ناٹک کھیلنا پڑتا ہے ------ چھبیلی اپنے بیاہ کا ناٹک کھیلنے کے لئے ترستی رہی اور وہ راس لیلا والا محبت کی بازی ہار کر سادھو بن گیا!

چھبیلی کئی سال تک اپنے سادھو کی واپسی کے انتظار میں کوے اڑاتی رہی پھر کوّوں کی طرح اس کے بالوں کا رنگ بھی اُڑ گیا۔ لیکن اسے اب بھی اپنے سادھو کی واپسی کا انتظار تھا' اور اب وہ اپنے بالوں میں سُرخ مہندی لگانے لگی تھی جو وہ گاؤں کی جوان لڑکیوں کی ہتھیلیوں میں شگون کے لئے لگایا کرتی---- ہر روز اپنی آنکھوں میں کاجل بھی لگاتی رہتی اور کچھ دیر بعد جب کاجل آنسوؤں سے گیلا ہو جاتا تو آنچل سے پونچھ کر چھڑا دیا کرتی۔

تمام عمر چھبیلی گاؤں کے جوان لڑکے لڑکیوں کی نسبت لگاتی رہی تھی۔ لیکن اب اسے یہ احساس ستانے لگا تھا کہ آدمی کی تمام ذاتیں جھوٹی اور بناوٹی ہیں۔ اچھے بھلے برہمن کی لڑکی سے اگر چھتری کے بیٹے کا بیاہ ہو جائے تو ان کے ہاں جو بیٹا پیدا ہو گا وہ یا تو نکٹا ہو گا یا لنگڑا!

اور جوں جوں آدمی کی ذاتوں پر سے چھبیلی کا اعتماد ہٹتا گیا اس کے دل میں مٹی کی ذاتوں کا اعتماد گہرا ہوتا گیا---- اگر کوئی ذات سچی اور اصل ہے تو وہ مٹی کی ذات ہے اور جب کبھی چھبیلی نائن کسی لڑکی کے ابٹن ملتی' کسی لڑکی کے جسم پر تیل کی مالش کرتی' کسی لڑکی کے بال سنوارتی تو وہ یہی سوچتی رہتی۔

چکنی مٹی' ریتلی مٹی' کنکریلی مٹی' سرخ مٹی' کالی مٹی' پیلی مٹی' مٹی کی بھی' کتنی ذاتیں ہیں۔ لیکن جس میں کپاس پیدا ہوتی ہے اس میں بس کپاس ہی پیدا ہوتی ہے' جس مٹی میں انگور پکتے ہیں اس میں بس انگور ہی پکتے ہیں! واقعی یہ ذاتیں کتنی سچی اور اصلی ہیں!

اور چھبیلی کی یہ تمام سوچ اور فکر اس دن کسوٹی پر چڑھ گئی جس دن گاؤں کے کھتریوں کی لڑکی بالو کو جاٹوں کے بیٹے نندا سے پیار ہو گیا۔

"کھترے دی بالو جاٹے دا نندا"

یہ جملہ گاؤں والوں کے ذہن پر مسلط ہو گیا۔ ایک کی زبان پر چڑھ گیا اور پھر مولے کھتری نے پاس والے گاؤں میں اپنی ہی ذات برادری میں بالو کی منگنی کر کے

اس جملے کو دانتوں تلے پیس کر رکھ دیا---- کچھ ہی دیر بعد چھبیلی نائن کو بالو کے ہاتھوں میں بیاہ کی مہندی رچانے جانا تھا!

نندا کا کھیت چھبیلی کے گھر کی پشت پر تھا اور اپنے گھر کے پچھواڑے والی دیوار پر گوبر تھاپتے ہوئے چھبیلی نے متعدد بار بالو اور نندا کو کھیتوں کے آنچل میں باتیں کرتے دیکھا تھا اور وہ سوچنے لگی تھی---- اس دنیا کے سنار سونے میں تانبے کی ملاوٹ کرتے ہیں اور دنیا انہیں کچھ نہیں کہتی۔ لیکن جب اس دنیا میں دو محبت کرنے والے دل سونے میں سونا ملاتے ہیں تو دنیا ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان پر لعن طعن کرتی ہے۔

اور چھبیلی دیکھتی کہ نندا بالو کی میٹھی میٹھی باتوں کو سونے کی لہروں کی مانند چنتا اور سنبھال سنبھال کر اپنے دل میں محفوظ کرتا رہتا اور بالو نندا کی پیار بھری باتوں کو سونے کے قیمتی ٹکڑوں کی مانند اپنے دل کے پردوں کے پیچھے چھپاتی رہتی اور پھر سانسوں کی دھیمی آگ پر یہ سارا سونا پگھل جاتا اور سونے کی مہریں اور سونے کے قیمتی ٹکڑے ایک دوسرے میں تحلیل ہو جائے تب راہ چلتے چوروں کی آنکھیں حیرت سے پھٹ جاتیں اور دلوں کا پگھلا ہوا سونا گھبرا کر منجمند ہو جاتا۔ سونے کی اینٹیں بن جائیں اور وہی سونے کی اینٹیں پر یمیوں کی پیشانی پر مار دی جاتیں۔

شادی والے گھر چھبیلی نائن کو دوبار بلاوا آ چکا تھا۔ وہ اپنے گھر سے نکلی اور اپنے گھر کے دروازے کے ساتھ ہی اس نے اپنی سوچ اور فکر بھی اندر بند کر دی۔ باہر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی چھبیلی نے ہاتھ سے اپنی پیشانی پر گرے ہوئے لال لال بالوں کو سنوارا اور ڈوپٹے کا آنچل سر پر رکھ لیا۔ ابھی وہ بمشکل دس قدم ہی چلی تھی کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے سے آنچال سر ڈھلک گیا اور لال بالوں کی ایک لٹ پیشانی پر جھول گئی۔

اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں ایک رنگین خیال ابھرا۔

"ایک منٹ کے لئے بے چارے نندا کا چہرہ تو دیکھ آؤں۔"

اور وہ نندا کے کھیتوں کی جانب چل پڑی۔

کنویں پر پروٹ چل رہا تھا۔ نندا کنویں کی جگت پر موجود نہ تھا لیکن اس کا

ایک دوست بیٹھا کنویں کے اندر سے نکلتی ہوئی آواز میں گا رہا تھا۔

"ہیر نے کہا جوگی جھوٹ کہتا ہے

کون روٹھے ہوئے یار کو مناتا ہے؟

بچھڑے اور مرے ہوئے کو کون ملائے؟

لوگ یونہی دلاسا دیتے ہیں....."

چھبیلی کا دل بھر آیا---- "واقعی مرے بچھڑے ہوئے برابر ہوتے ہیں۔"

چھبیلی نے دیکھا کہ نندا سر جھکائے کھیت کی مینڈ پر بیٹھا ہے اور اس کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے آنسو نیچے گر کر بہتے ہوئے پانی میں مل رہے ہیں۔ چھبیلی نے سوچا---- یہ پانی جن کھیتوں میں پہنچے گا ان کی فصل سے آنسوؤں کی بو آئے گی!

نندا نے چھبیلی نائن کو دیکھا اور فوراً" منہ پھیر لیا۔ چھبیلی نے پیشانی پر جھولتی ہوئی لٹ کو پیچھے کیا اور احتیاط سے آنچل سر پر ڈال لیا---- اسے یوں لگا جیسے نندا کے پاس بالو کو دینے کے لئے کوئی پیغام تھا نہ کوئی شکوہ!

چھبیلی شادی کے گھر میں داخل ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی---- "ہمارا پیشہ بھی عجیب ہے کوئی چاہے آباد ہو یا برباد ہمیں اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہمارا کام تو رسمیں پوری کرنا اور نیگ لینا ہے۔"

چھوٹی چھوٹی لڑکیاں مہندی کے تھال کے گرد بیٹھی ہوئی چھبیلی کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ سب لڑکیاں جانتی تھیں کہ جیسی مہندی چھبیلی لگاتی ہے ویسی گاؤں میں کوئی دوسری عورت نہیں لگا سکتی۔

"پہلے مجھے، پہلے مجھے!"

چھبیلی کو دیکھتے ہی کئی لڑکیاں چیخ اٹھیں۔ حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ سب سے پہلے دور کونے میں دبکی ہوئی بالو کو مہندی لگائی جائے گی اور اس کے بعد کسی اور کی باری آئے گی۔

"کیسی اتراتی ہوئی آئی ہے۔"

"ارے اگر نائن نے آج نخرہ نہ دکھایا تو کب دکھائے گی؟"

"کب سے بے چاری لڑکی بیٹھی سوکھ رہی ہے۔ اتنی دیر لگا دی، تجھے ہتھیلی پر ذرا سی مہندی یہ تو تولگانی ہے کوئی ہل تھوڑی ہی چلانا ہے۔"

"بالو کی ماں اور خالہ نے ایک ہی سانس میں چھبیلی پر کئی چوٹیں کر ڈالیں۔ چھبیلی کے دل میں آیا کہ کہہ دے۔۔۔۔ " آج تو تم مجھ سے ہل ہی چلوا لیتیں اچھا تھا" .... لیکن چھبیلی نے کچھ کہنے سے پہلے بالو کی جانب دیکھا اور اس کے منہ کی مانند اپنا منہ بھی بند کرلیا۔

بالو سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک تنکا تھا جس سے وہ اپنے پاؤں کے قریب کی کچی زمین کرید رہی تھی۔ رہ رہ کر آنسوؤں کی دو ایک بوندیں اس کے چکنے گالوں پر سے پھسل پڑتیں اور نیچے کریدی ہوئی مٹی میں جذب ہو جاتیں۔ چھبیلی نے بالو کے ہاتھ سے تنکا لے کر دور پھینک دیا اور اس کی سفید ہتھیلی کھول کر اس پر مہندی لگانے لگی۔ چھبیلی کو محسوس ہو رہا تھا کہ چند ہی دنوں میں مہندی کا رنگ تو اتر جائے گا لیکن تنکے سے کریدی ہوئی مٹی میں بالو نے آنسو بوئے ہیں وہ کسی نہ کسی دن ضرور اگ آئیں گے!

پاس کھڑی ہوئی عورتوں نے سہاگ گیت گانا شروع کیا:۔

بابا میری گلیاں تنگ ہو گئیں

میرا آنگن اب پردیس ہو گیا.....!

اور چھبیلی جس نے آج اپنے سر پر پھولدار دوپٹہ ڈالتے ہوئے یہ نہیں دیکھا تھا کہ اس نے دوپٹہ الٹا اوڑھ لیا ہے۔ ہربات کا الٹا مفہوم سمجھ رہی تھی۔

وہ سوچنے لگی۔

" لڑکیوں کی بھی کیسی قسمت ہوتی ہے کہ ان کے ماں باپ کی گلی اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ ایک پیارا چہرہ بھی اس میں سے نہیں گزر سکتا لیکن ایک بہت بڑی بارات اس گلی میں سے نکل جاتی ہے.....!"

"کھتریوں کی اپنی ذات ہوتی ہے اس جاٹ کے بیٹے نے یہ کیوں بھلا دیا؟"

بارات قریب آتی گئی، عورتوں کی چیخ و پکار تیز ہوتی گئی اور بالو نندا کی پریم

کہانی کو اپنے دانتوں تلے چباتی رہی۔

"تو کھتریوں کو اپنی ذات کا رشتہ مل گیا؟"---- چھبیلی نائن نے ایک طویل سانس لی اور سوچنے لگی۔ لیکن مٹی کی ذات کسی نے دیکھی۔ ایک بنجر گھوڑے پر بیٹھ کر چکنی مٹی کو بیاہنے آگیا۔ بنجر سہرا باندھ کر گھوڑے پر چڑھا اور چکنی مٹی گوٹے کناری والا سرخ جوڑا پہن کر ڈولی میں بیٹھ گئی۔

اجنبی

نہ جانے کیوں لوک ناتھ کو اپنی زندگی کی ہر بات کسی نہ کسی جانور کی صورت میں یاد آتی بچپن کے کتنے ہی پل کسی ناچتی ہوئی بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرتے ہوئے اس کے پاس سے گزر جاتے تھے۔

لوک ناتھ کا چھوٹا بھائی پریم ناتھ اب نیوی میں تھا۔ اکہرے بدن کا لمبا سا خوبصورت نوجوان لیکن بچپن میں وہ پڑھائی میں بھی اتنا ہی کمزور تھا۔ جتنا جسمانی طور پر۔ لوک ناتھ جب اسے پڑھانے کے لئے کبھی اپنے پاس بٹھاتا تھا تو کتاب کے لفظوں پر سکڑی ہوئی اس کی آنکھیں کئی بار اچانک خوف سے پھیل کر لوک ناتھ کے چہرے کو تکنے لگتی تھیں اور پھر جب لوک ناتھ اسے دلاسا دیتا تھا' تو جیسے منت سی کرتی ہوں' اس کی آنکھیں پگھلنے لگتی تھیں اور اب وہ نیوی کا افسر بننے کے بعد نئی نئی بندر گاہوں پر جاتا تھا۔ وہاں سے تصویریں کھینچ کر لوک ناتھ کو بھیجتا تھا تو لوک ناتھ کو اس کے ساتھ بتائے ہوئے لمحوں کی یاد بالکل ایسے آتی تھی جیسے ایک چھوٹا سا پلا دم ہلاتے ہوئے اپنی گیلی زبان سے اس کے تلوؤں کو چاٹنے لگا ہو۔

اس نے دل سے کسی سیاسی پارٹی کی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لینا چاہا تھا' مگر تجربے کی بھوک اسے اکثر میٹنگوں میں لے جاتی تھی' اسے نہیں معلوم تھا کہ کب خفیہ پولیس نے اپنے کاغذوں میں اس کا نام درج کر لیا تھا اور اس کے بارے میں اپنی لمبی چوڑی رائے قائم کر رکھی تھی۔ اس کی ڈگریوں سے گھبرا کر جب کبھی کوئی سرکاری دفتر اسے ملازم رکھنے کا وعدہ کر لیتا' تو پریس کی یہی لمبی چوڑی رائے اس وعدے کو ایک جھٹکے میں توڑ کر رکھ دیتی۔ اب جب کہ لوک ناتھ ایک کالج کا پروفیسر

تھا اور اپنے لئے اس نے ایک مستقل مقام بنا لیا تھا تو اسے بیشتر پریشان لمحوں کی یاد ان ابابیلوں اور بندروں کا روپ دھار کر آتی تھی جو نہ جانے کہاں آتے تھے اور اس کے ہاتھوں میں خراشیں ڈال کر روٹی کا ٹکڑا چھین لے جاتے تھے۔

سرکاری دفتروں کی ڈھیلی رفتار اسے کیچوؤں جیسی لگتی۔ قابلیت کے راستے میں آڑے آنے والی جلن اسے سانپ کی طرح پھنکارتی سنائی دیتی بہت سے لوگوں کے حسد اور جلن کو اس نے اپنے جسم پر جھیلا تھا۔ بالکل بھینس کے سینگوں کی طرح' اپنے رشتہ داروں کے فضول غصے اور روٹھنے کے لمحات اسے الماری میں گھسے ہوئے چوہے معلوم ہوئے تھے جو قیمتی کاغذوں کو کترے چلے جاتے ہیں۔

لوک ناتھ اپنی بیوی پر جان دیتا تھا۔ قصے کہانیوں کی شہزادیوں سے بھی زیادہ اسے چاہتا تھا اس کے ساتھ بیتی ہوئی گھڑیاں' لوک ناتھ کی نظر میں ایسی تھیں جیسے ننھی ننھی چڑیاں اس کے آس پاس چہکتی ہوں' جیسے بگلوں کی ایک قطار بادلوں کو کاٹ کر گزری ہو' جیسے فاختاؤں کے کچھ جوڑے اس کی کھڑکی میں آکر بیٹھ گئے ہوں' جیسے طوطوں کا ایک جھنڈ اس کی آنگن کے پیڑ پر آکر بیٹھا ہو۔ اپنی بیوی کے خط اور بیوی کے نام لکھے ہوئے اپنے خط لوک ناتھ کو ہمیشہ ان کبوتروں جیسے لگتے تھے' جو کسی دیوار کی آڑ میں گھونسلا بنانے کے لئے تنکے جوڑتے رہتے ہیں۔

شادی سے پہلے لوک ناتھ اپنی بیوی کو اس کے ہر جنم دن پر ایک کتاب پیش کیا کرتا تھا شادی کے بعد ہر سال جنم دن پر اسے چوم کر رکھتا تھا: "میری عمر کا یہ سال ایک کتاب طرح تمہاری نذر" اس طرح لوک ناتھ اپنی بیوی کو اپنی عمر کے 25 سال 25 کتابوں کی طرح سوغات میں دے چکا تھا' اسے یقین تھا کہ اس کے جیتے جی اس کی بیوی کا کوئی ایسا جنم دن نہیں آئے گا جب وہ اپنی زندگی کا کوئی سال ایک کھلی کتاب کی طرح اسے پیش نہ کرسکے۔

صرف ایک بار ایسا ہوا۔

بائیس سال پہلے کی بات ہے۔ ایک صبح لوک ناتھ چارپائی سے اٹھا تو اس کا بدن تپ رہا تھا۔ رات کو وہ اچھا بھلا سویا تھا۔ گری والا ایک ایک کیک لا کر اس نے

اپنی الماری میں رکھا تھا۔ اس بار پتہ نہیں کیوں اس کی بیوی کو اپنا جنم دن یاد نہیں رہا تھا' اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس کی ایک بہت پیاری سہیلی کئی برس بعد اس دن غیر ملک سے واپس آرہی تھی اور اسے اس سے ملنے کے لئے جانا تھا۔ لوک ناتھ نے صبح اپنی بیوی کو چونکانے کے لئے کیک لاکر الماری میں چھپا دیا تھا۔ لیکن صبح کو جب وہ جاگا تو اس کے سر میں زوروں کا درد ہو رہا تھا۔ بیوی کے ساتھ اس نے چائے بھی پی' اور کیک بھی کھایا۔ اسے چونکایا بھی' اسے چوم کر اسے اپنی عمر کا ایک سال کتاب کی طرح سوغات میں بھی دیا۔ مگر اس کے بعد سارا دن چارپائی سے نہیں اٹھ سکا تھا۔ اس دن وہ سوچ رہا تھا کہ جو کتاب اس نے اس بار اپنی بیوی کو دی تھی۔ اس کا ایک ورق اس میں پھٹا ہوا تھا۔ اس رات وہ پھٹا ہوا ورق کسی جانور کے ٹوٹے ہوئے پنکھ کی طرح اس کی چھاتی میں ہلتا رہا---- لوک ناتھ کی زندگی کے کچھ پل اُڑتے ہوئے معصوم پرندوں کی طرح تھے کچھ پل پالتو پرندوں کی طرح اور کچھ جنگلی جانوروں کی طرح تھے' کسی پل سے وہ کبھی ڈرا نہیں تھا۔ چونکا نہیں تھا مگر ایک گھڑی ..... ہاں لوک ناتھ کی زندگی میں وہ ایک گھڑی بھی آئی تھی۔ مشکل سے پندرہ منٹ کے لئے---- جو چمگاڈر کی طرح اس کے دل میں چپک گئی تھی۔ ہوش و حواس کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں۔ لیکن وہ گھڑی کسی اندھی چمگاڈر کی طرح بار بار دیواروں سے ٹکراتی رہی تھی اور بار بار لوک ناتھ کے کانوں پر جھپٹتی رہی تھی۔ لوک ناتھ نے گھبرا کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے اور کچھ منٹ کے لئے اسے آوازیں سنائی نہیں دی تھیں---- ضمیر کی آواز بھی نہیں۔ مگر ایک آواز تھی' جو اس وقت بھی کنپٹیوں میں گونج رہی تھی اور خون کی اس آواز سے چھٹکارا پانے کے لئے اس نے .....

بائیس سال بیت گئے تھے لیکن وہ گھڑی---- مشکل سے پندرہ منٹ کی وہ گھڑی لوک ناتھ کو جب کبھی یاد آجاتی ..... یاد نہیں آتی تھی' بلکہ چمگاڈر کی طرح اس کے سر پر اڑتی تھی ..... تو لوک ناتھ گھبرا کر اسے جلدی سے باہر نکال دینے کے لئے اس کے پیچھے دوڑنے لگتا تھا۔

اس چمگادڑ کے آنے کا کوئی وقت نہیں تھا کبھی "فرائڈ" کے صبح اٹھتے ہوئے وہ اچانک آجاتی تھی۔ تو کبھی کسی خوبصورت نظم کو پڑھتے ہوئے بھی وہ دکھائی دے جاتی۔ ایک بار اپنے نومولود بیٹے کی گردن سے دودھ کی مہک سونگھتے ہوئے بھی لوک ناتھ وہ چمگادڑ نظر آئی تھی۔ اور آج جب لوک ناتھ کی بڑی بیٹی بیجنتا میکے میں بچے کی پیدائش کے دن کاٹنے کے بعد سسرال جانے لگی تھی اور اپنے شیر خوار بچے کو جھولی میں لے کر اپنے باپ سے منت کی تھی کہ وہ اس کی چھوٹی بہن رینا کو کچھ دن کے لئے اس کے ساتھ سسرال بھیج دیں کیونکہ ننھا بچہ شاید اس سے اکیلے نہ سنبھلے، تو لوک ناتھ کے چہرے کا رنگ زرد پڑھ گیا تھا۔۔۔۔ ایک چمگادڑ اس کے سر پر منڈلانے لگی تھی۔ آنگن میں بیٹھی ہوئی اس کی بیوی، اس بیٹی، اسے لینے کے لئے آیا ہوا اس کا شوہر، جھولی میں پڑا ہوا بچہ کچھ فاصلے پر بیٹھی ہوئی اس کی دوسری بیٹی، آنگن میں کیرم کھیلتا ہوا اس کا بیٹا سب کے سب جیسے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ ہوش و حواس کی ساری کھڑکیاں کھلی تھیں۔ لیکن ایک زندہ چمگادڑ دیواروں سے سر پٹک رہی تھی، لوک ناتھ کے کانوں پر جھپٹ رہی تھی اور لوک ناتھ اسے جلدی سے باہر نکال دینے کے لئے اپنے من کے چاروں دائروں میں دوڑنے لگا۔

یہ چمگادڑ ایک یاد تھی۔ بات بائیس سال پہلے کی تھی..... لوک ناتھ کے گھر پہلا بچہ ہوا تھا۔۔۔۔ یہی بیجنتا۔ لوک ناتھ کی بیوی کافی کمزور ہوگئی تھی۔ اپنی بیوی کو میکے سے اپنے گھر لانے کی بجائے وہ اسے پہاڑ پر لے گیا تھا اسے اپنی سالی پندرہ سال کی ارمی بالکل اپنی بیوی جیسی دکھائی دیتی تھی۔ اکثر جب بچی سو رہی ہوتی تو ارمی کو اپنے ساتھ گھمانے کے لئے جاتا تھا۔ اس کی بیوی ابھی گھومنے پھرنے کے قابل نہیں تھی۔ کہیں کہیں چیڑ کے درختوں کے نیچے گرے ہوئے پتوں کی تہیں بیٹھ جاتی تھیں۔ ارمی دوڑنے لگتی تھی تو اسے پھسلنے سے بچانے کے لئے وہ اس کا ہاتھ پکڑا لیتا تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس ارمی کو اس کے ہاتھوں کبھی ٹھیس بھی لگ سکتی تھی۔

ایک دن سیر کے لئے جاتے وقت اس نے اپنی بچی کی گردن کو چوما۔ سوتی

ہوئی بچی کے جسم سے سونفیا دودھ اور پاؤڈر کی عجیب سی ملی جلی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ بچی کی ماں بھی بچی کے پاس لیٹی ہوئی تھی۔ بچی والی خوشبو اسے اپنی بیوی کے بالوں میں سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر اسی دن کی بات ہے' سیر کرتے ہوئے جب اس نے ارمی کا ہاتھ کا پکڑ کر اسے پھسلواں چڑھائی چڑھنے کے لئے سہارا دیا تو اس کے شانے کو چھوتی ہوئی اس کے سانسوں میں سے بھی اسے وہی بو لپکتی محسوس ہوئی---- لوک ناتھ اپنی بیوی سے مذاق کرتا ہی رہتا تھا' اسی لہجے میں وہ ارمی سے بھی بولا "بے بی کا سونفیا دودھ معلوم ہوتا ہے تم دونوں کو بھی اچھا لگنے ہے۔"

اس کے بعد لوک ناتھ کو نہیں معلوم کہ کیا اور کیسے ہوا۔ ایک بو تھی جو اس کے گلے میں سمٹ آئی تھی---- سونفیا دودھ کی' پاؤڈر کی گداز اور نرم گوشت کی اور چیڑ کی پیڑوں کی اور لوک ناتھ کو محسوس ہوا کہ جنگل کی کھلی ہوا میں بھی اس کا دم گھٹ رہا تھا اور پھر یہ تو کہرے کی طرح اٹھی اور اس کے حلق سے ہو کر دماغ پر چھا گئی اور پھر سارے چہرے کہرے کی دھند میں چھپ گئے۔ ارمی کا چہرہ اس کی بیوی کا چہرہ اس کی بچی کا چہرہ چہروں کا احساس ہوتا تھا لیکن پہچانے نہیں جاتے تھے پھر لوک ناتھ کو ایسا لگا کہ نزدیک و دور کوئی بستی نہیں تھی' جہاں تک نظر جاتی تھی وہاں' تک صرف کھنڈر ہی کھنڈر تھے' پھر کسی کھنڈر کے چمگادڑوں کی ایک تیز بو اٹھی اور اس کے سر میں سما گئی' پھر اسے محسوس ہوا جیسے کسی دیوار کی آڑ سے نکل کر چمگادڑ اس کے کانوں میں جھپٹنے لگی ہو اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں کانوں پر رکھ لئے تھے۔ کچھ دیر تک اسے کوئی آواز سنائی نہیں دی---- ضمیر کی آواز بھی نہیں۔ لیکن ایک آواز اسے اب بھی سنائی دے رہی تھی' کانوں سے نہیں سنائی دے رہی تھی بلکہ خون کی ہر بوند سے ابھرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

یہ جیسے ایک بہت بڑی سازش تھی---- ضمیر کی آواز رگوں میں ڈورتے ہوئے خون کی آواز' اور چہرے کی ہر پہچان کی خلاف ایک بو کی سازش تھی۔ جنگل کی کھلی کی ہوا کے خلاف ایک بو کی سازش تھی' ہر آبادی کے خلاف ہر کھنڈر

کی سازش تھی۔

لوک ناتھ کسی کی کوئی سازش نہ سمجھ سکتا۔ پندرہ منٹ کا وہ وقت جب اس کی عمر سے ٹوٹ کر ایک انگ کی طرح دور جا پڑا تو لوک ناتھ کو لگا کہ اس ساری زندگی اپاہج بن کر رہ گئی تھی۔

اس شام کو جب وہ گھر لوٹا تو بیوی کے کمرے میں جلتی ہوئی موم بتی کو دیکھ کر اسے ایسا لگا جیسے موم بتی کی لپٹ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر تھرتھراتی ہوئی جلدی سے بجھ جانا چاہتی تھی۔

جب رات بھر آئی تو اندھیرا لوک ناتھ کو اچھا لگا لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ ایک اور اندھیرا اس کی چھاتی میں سما گیا تھا۔ اندھیرے کا ایک ٹکڑا رات کے اندھیرے سے ٹوٹ کر الگ جا پڑا تھا۔ رات کا اندھیرا تالاب کے پانی کی طرح ٹھہرا ہوا تھا' جس میں سے ایک بو اٹھ رہی تھی۔ اس رات لوک ناتھ کو کتنے ہی خیال آئے اسے محسوس ہوا کہ وہ سارے اس تالاب میں تیرتے ہوئے مچھروں جیسے تھے۔

دوسرے دن وہ پہاڑ سے لوٹ آیا تھا' وہ اری کو اس کے باپ کے پاس چھوڑ آیا تھا پھر اری اس کے بیاہ کے دن ایک بار بھر آنگن میں ملنے کے علاوہ وہ کبھی نہیں ملا تھا۔ یہ ایک معذرت تھی' جسے وہ ساری عمر خود کو غیر حاضر سمجھ کر اری سے مانگتا رہا تھا۔

"پاپا جی" بیتا نے منت کے ساتھ لوک ناتھ کی خاموشی کو توڑنا چاہا اور دھیرے سے بولی "آپ کیا سوچ رہے ہیں پاپا؟ ویسے میں جانتی ہوں آپ "نہ" نہیں کریں گے۔"

"کیا" لوک ناتھ نے حیران ہو کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ یہ بیٹی اسے بہت پیاری تھی۔ اس کی بات اس نے کبھی نہیں ٹالی تھی' لیکن وہ حیران تھا کہ اگر کوئی ہونی وقت کے ساتھ مل کر ایک سازش کرنے لگی تھی تو اس کی بیٹی اس سازش کو سمجھ کیوں نہیں رہی تھی۔

"ریتا کو میں کچھ دن کے لئے اپنے ساتھ لے جاؤں؟ یہ سونی مجھ سے سنبھلتی نہیں ----" پیتا پھر کہہ رہی تھی۔

ماں نے بھی حامی بھری---- "ایک مہینے تک ریتا کا کالج کھل جائے گا۔ یہی چھٹیوں کا ایک مہینہ ہے۔ ایک مہینہ اس کے یہاں ہی سہی۔ راجندر بھی زور ڈال رہا ہے۔"

"راجندر بڑا ہونہار ہے" لوک ناتھ کو خیال آیا اور پھر اپنے داماد کے چہرے کی طرف دیکھتے اسے محسوس ہوا کہ کوئی ہونی ایک پاگل کتے کی طرح اس اچھے لڑکے کاٹنے کے لئے دانت نکوس رہی تھی---- وہ تن کر کھڑا ہو گیا' اس طرح جیسے وہ اسے پاگل سے بچا سکتا تھا۔

"میں اگلے ہفتے خود آکر ریتا کو چھوڑ جاؤں گا۔" راجندر نے دھیرے سے کہا۔

"نہیں۔ بالکل نہیں۔" لوک ناتھ نے ذرا سختی سے کہا---- سب نے گھبرا کر لوک ناتھ کی طرف دیکھا' پھر ایک دوسرے کی طرف اس طرح جیسے انہوں نے لوک ناتھ کی آواز نہیں سنی تھی کسی اجنبی کی آواز سنی تھی!

عمارت ساز

کہتے ہیں ہیر کی سہلیاں حسن کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر جب مل بیٹھتیں تو قیامت کا حسن ایک گروہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتا۔ اسی طرح گاف روڈ کی کوٹھیاں بھی ہیر کی سہلیاں تھیں۔ بانکی، شوخ، آراستہ پیراستہ اور ان سب میں راج میت کی کوٹھی تو واقعی ہیر تھی۔ شوخ و شنگ، چنچل اور البیلی۔

باقی کوٹھیوں کے باغیچے کسی دیہاتی حسینہ کے بالوں کی منڈھیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے عشق پیچاں کی بیل آڑو کے درخت پر لہرا کر چڑھ گئی تھی۔ توری کی بیل موتیا کے پودوں کے اوپر سایہ کرتی گزرتی تھی۔ اسی لئے راج میت ازراہ مذاق کہا کرتا تھا کہ میرے اس باغ کا پتہ پتہ میرے خیالوں کی طرح الجھا پڑا ہے۔ لیکن لوگ اس کی امریکن طرز کی کوٹھی میں پودوں کے اس خود رو اور بے ترتیب انداز کو دیکھ کر کہہ اٹھتے تھے کہ اس نے شہری دل کشی کو جنگلی ٹچ دے کر ایک نیا حسن پیدا کیا۔

ڈاکٹر دیوان چند نے جب شہر کے سب بڑے عمارت ساز راج میت کی اس کوٹھی کو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے اور پھر امید بھرے دل کے ساتھ اس کوٹھی میں داخل ہوئے۔

دار صل وہ راج میت سے ملنے کے لئے بے قرار تھے۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ صرف بڑی سرکاری عمارتوں کے نقشے تیار کرتے ہیں اور ایک رہائشی گھر کا نقشہ تیار کرنے پر رضامند نہ ہوں گے۔۔ پھر بھی آپ کے

پاس آیا ہوں" ڈاکٹر دیوان چند نے خود ہی کہہ دیا۔

راج میت یہ سن کر مسکرا دیا۔

"میری بیوی کے دل میں نہ جانے کون سے گھر کا خیال سمایا ہوا ہے، کئی نقشے تیار کرا چکا ہوں، اور رد کر چکا ہوں۔ لیکن ..... اب آپ کی شہرت سنی۔ یہ بھی سوچا کہ آپ ایک معمولی کام کیسے ہاتھ میں لیں گے پھر بھی ایک موہوم امید کا دامن تھامے یہاں آیا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں عمارتوں کے نقشے تیار کرنے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں۔"

راج میت نے سنا تو اس کے دل نے جیسے کہا "اگر لوگ ایسا کہتے ہیں تو غلط کہتے ہیں۔ ممکن ہے عمارتوں کے نقشے بنانے میں میرا مقابل کوئی نہیں ہو۔ لیکن ایک گھر کا نقشہ یہ تو میں نے آج تک کبھی بنایا ہی نہیں۔ جب کبھی میں کسی گھر کا نقشہ تیار کرنے بیٹھتا ہوں تو وہ ایک خوبصورت عمارت کا نقشہ بن کر رہ جاتا ہے۔"

لیکن راج میت نے اس جواب کو اپنے ہونٹوں تک ہی رکھا اس کے ساتھ ہی اس کی مسکراہٹ بھی دب کر رہ گئی۔

"فیس کے بارے میں تو اب میں کیا کہوں۔ آپ تو لاکھوں روپے کا کام کرتے ہیں۔ چھوٹی موٹی رقم سے آپ کو کیا دل چسپی ہو سکتی۔ پھر بھی میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کاروبار نقطہ نظر سے نہ سہی، کسی بھولے بھٹکے خواب کی تعبیر سمجھ کر ہی آپ یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔"

"لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ میں آج تک کسی مکان یا کوٹھی کا نقشہ تیار ہی نہیں کیا۔"

"آپ نے اپنے اس گھر کا نقشہ تو بنایا۔"

"میرا گھر----؟" راج میت کی نگاہیں دیواروں سے جا کر ٹکرائیں اور پھر چھت کو دیکھتی ہوئی بیٹھک سے باہر کی طرف کھلتے ہوئے دروازے سے نکل گئیں۔

راج میت کے پاس سیدھا سادا جواب تھا کہ گھر کا ایک نقشہ تو وہ ہے جس میں گھر والے کی بیٹھک کا دروازہ گھر والی کے کمرے میں کھلے جس سے وہ محبت کرتا

ہو۔ اور اس قسم کے گھر کا نقشہ اس نے کبھی تیار نہیں کی تھا کیونکہ اس نے ایسا کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ راج میت جواب دے تو دیتا لیکن وہ خاموش رہا۔ اسے ڈر تھا کہ ہی بات ڈاکٹر دیوان چند کی سمجھ میں ہرگز نہیں آئے گی۔ کیونکہ اس سیدھی سی بات سی کو آج تک کوئی سمجھ پایا تھا۔

"نہ جانے کس گھر نقشہ ہے میری بیوی کے دماغ میں؟ وہ کہتی ہے جب میں رات کو سوتی ہوں، تو وہ گھر میری آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے۔ لیکن جاگتے ہی سب کچھ گم ہو جاتا ہے اور اپنے زبان سے میں گھر کی تفصیل بیان کی نہیں کر سکتی۔"

راج میت نے ٹھنڈی سانس لی جو سگریٹ کے دھوئیں میں غلط ملط ہوگئی اور پھر اسے یوں محسوس ہوا، جیسے کسی نے اس کے دروازے پر دستک دی ہو۔

برسوں پرانی یادوں نے جیسے راج میت کے کمرے کے دروازہ کھٹکھٹانے شروع کر دیئے۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک یاد بڑی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی اور راج میت کے بائیں طرف یعنی دل کی طرف آکر رک گئی۔ راج میت نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا یہ ستی تھی، جس نے ابھی سولھویں برس میں قدم رکھا تھا۔ وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے نانا کے گاؤں آئی تھی۔ راج میت ان دنوں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اور اس نے ان چھٹیوں کو اپنے ماموں کے شہر میں گزرانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ لیکن ستی کو دیکھتے ہیں اسے یوں محسوس ہوا جیسے شہر کا تمام دل فریبیاں اور رعنائیاں خود چل کر اس گاؤں میں آگئی ہوں ---- اب وہ شہر جاکر کیا کرتا----

اسی وقت کھلے دروازے سے ایک اور یاد لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی آگئی اور وہ آکر اس کے دائیں طرف کھڑی ہوگئی۔ گاؤں کی سبھی لڑکیاں ستی کی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ ان کی دیکھا دیکھی۔ ستی نے بھی رنگین پیڑھے پر بیٹھ کر رنگ برنگ ریشمی تاگوں سے پھلکاری کاڑھنی شروع کردی۔

راج میت کے استادوں کو یہ شکایت تھی کہ پڑھائی میں سب کے ہوشیار ہونے کے باوجود وہ بہت ہی بدخط تھا لیکن ستی کی پھلکاری پر جیسے جیسے رنگ برنگے ریشمی پھول بنتے گئے' راج میت کاپیوں پر بھی جادو ہوگیا۔ اس کے حروف بھی موتیوں کی طرح صاف ہوتے چلے گئے۔ ڈرائنگ کی کاپی میں اس کی لائنیں اور رنگ ان کہی داستانیں سنانے لگے۔

بیرونی دروازے سے ایک اور یاد سمٹ کر داخل ہوئی---- ستی نے اپنے ماموں زاد بھائی کے ہاتھ راج میت سے اس کی کچھ کتابیں اور کاپیاں منگوا بھیجی تھیں۔ وہ بھی دسویں کا امتحان دینے والی تھی اور راج میت کے بارے میں شائد اسے پتہ چل گیا تھا کہ وہ کلاس میں سب سے ہوشیار ہے۔

جب ستی نے کتابیں واپس بھیجیں' تو حساب کی کتاب کے پہلے صفحے پر راج میت کے نام کے ساتھ ستی نے پنسل سے اپنا نام بھی لکھ دیا تھا۔ راج میت نے یہ دیکھا تو اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی پھر تو اس کا یہ معمول ہوگیا کہ ادھر کتاب پر نظر گئی ادھر دل کی دھڑکن بڑھی وہ اپنی زندگی کا نیا حساب کتاب کرنے بیٹھ جاتا۔ پنسل سے لکھے ہوئے ستی کے نام کو اس نے سیاہی سے گہرا کر دیا۔

گاؤں والی کی انگشت نمائی سے بچنا ہو تو کسی لڑکی سے بات کرنے کے لئے ایک نوجوان کو سو بہانے درکار ہوتے ہیں۔ گاؤں کے چھل کپٹ سے آزاد جیون میں کوئی ایسا بہانہ یا موقع تلاش کرنا بڑا جوکھم کا کام ہے۔ جب وہ ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے تو ان کی نگاہیں بہت لمبے قول اقرار کر جاتیں۔

گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہونے کو آئیں شہر جانے سے پہلے ستی نے راج میت کی دوسری کتاب اٹھائی تو اس میں ایک پرزہ تھا۔

"دسویں پاس کرنے کے بعد شہر میں آجایئے۔ کالج میں ایک ساتھ پڑھیں گے۔

راج میت کی انگلیاں جل اٹھیں اس نے جھٹ دوسرا سگریٹ سلگا دیا۔

بڑے دروازے سے ایک اور یاد لڑکھڑاتی ہوئی داخل ہوئی اور راج میت

کے کندھے کے پاس سر جھکا کر کھڑی ہو گئی---- راج میت سالانہ امتحان میں مشکل سے پاس ہوا تھا۔ نمبر اچھے نہیں آئے تھے۔ اس لئے اسے کسی کالج میں داخلہ نہ مل سکا وہ بمبئی چلا گیا۔ یہاں پہلے پہل اس نے بجلی کا کام سیکھنا شروع کیا۔ پھر ریڈیو کی دکان پر ملازمت اختیار کی ---- لیکن اس کا دل نہ لگا۔ آخر کار اس نے آرٹ سکول میں داخلہ لے لیا اور فن تعمیرات کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔

راج میت کی جد و جہد سے بھری ہوئی زندگی کی راہوں پر ستی کے وعدوں بھرے خطوں کے چنگو ٹمٹاتے رہے۔ جب بھی کاغذ پنسل سے عمارتوں کے ڈیزائن تیار کرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ ایک خوابوں سے بھی زیادہ حسین گھر کا نقشہ تیار کر رہا ہوں جس کا دروازہ ستی کے دروازے کی طرف کھلتا اور پھر----

کچھ برس بعد جب وہ فن تعمیرات کی سند حاصل کر کے بمبئی سے واپس آیا تو ستی کے ماں باپ نے اپنی زمین گروی رکھ دی تھی ستی کی سگائی وہ کہیں اور چکے تھے۔ ستی نے رو کر صرف یہی کہا تھا۔

"راج مجھے معاف کر دو۔ میں نہیں جانتی تھی کہ میری زبان کو اقرار کرنے کا کوئی حق نہیں شاید ہمارے دیش میں کسی بھی عورت کے ہونٹوں کو قول دینے کا اختیار نہیں۔"

راج میت کا چہرہ غصے سے تمتا اٹھا۔ وہ ان سب یادوں کو پھٹکار رہا تھا "اب تم یہاں کیا کرنے آئی ہو' تم یہ بخوبی جانتی ہو کہ میں لاکھ کوشش کرنے پر بھی ایک گھر کا نقشہ تیار نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ میری بیٹھک کا دروازہ جس عورت کے کمرے کی طرف کھلتا ہے وہ ستی نہیں۔"

ڈاکٹروں دیوان چند حیران پریشان بیٹھے تھے۔ راج میت کی خاموشی ٹوٹنے میں ہی نہیں آتی تھی۔ راج میت کے انکار پر تو وہ منت سماجت کر سکتے تھے۔ لیکن اس خاموشی پر وہ کیا کرتے؟

اسی وقت ایک نوکرانی کمرے میں داخل ہوئی۔ ڈاکٹر دیوان چند کی محسوس ہوا جیسے وہی ان کی مشکل کا حل بن کر آئی ہو۔ نوکرانی راج میت سے مخاطب ہو گی

پھر راج میت کی خاموشی ٹوٹے گی۔

"صاحب میم صاحب کی تکلیف بڑھ گئی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

راج میت کو بات سمجھنے میں پہلے وقت ہوئی پھر اسے کچھ خیال ڈاکٹر دیوان چند سے اس نے کہا" معاف فرمایئے مجھے گھر میں ڈاکٹر کو بلانا ہے۔ آپ کی مرضی کے مطابق ڈیزائن تیار کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ کسی اور آرکی ٹیکٹ۔۔۔۔"

ڈاکٹر دیوان چند ڈیزائن والی بات کو ان سنی کرتے ہوئے بولے۔ "مسز راج میت کو کوئی تکلیف ہے؟ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میری خدمات حاضر ہیں۔"

"شکریہ۔۔۔۔ لیکن اس وقت ایک لیڈی ڈاکٹر کی ضرورت ہے" یہ کہہ کر راج میت اٹھ کر چلنے لگا۔

"آپ بیٹھئے۔ میری بیوی ہسپتال میں سب سے بڑی ڈاکٹر ہے میں چند منٹ میں اسے یہاں لے آتا ہوں۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا اور راج میت رک گئے۔

ڈاکٹر دیوان چند چلے گئے۔ لیکن راج میت بہت پریشان تھا کیونکہ یہ بن بلائی یادیں جو زبردستی اس کے کمرے میں آگئی تھیں' واپس جانے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ پہلے تو اس نے انہیں منت سماجت سے لوٹ جانے کو کہا۔ لیکن وہ نہ جانے کس ارادے سے آئی تھیں۔ انہوں نے راج میت کے ماتھے کی تیوریوں کی پروا کی نہ منت سماجت کی۔ وہ بڑے آرام سے کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔ کمرے کی چیزوں کو الٹ پلٹ کر رہی تھیں۔ آپس میں باتیں کر رہی تھیں۔ راج میت چپ چاپ بیٹھا ان کی طرف دیکھتا رہا۔ کرسیوں' میزوں' کتابوں' تصویروں' سب کا یادیں جائزہ لے رہی تھیں۔ پھر وہ ایک میز کے قریب آکر رک گئیں۔ دراز کو کھولا۔ ایک ریشمی رومال میں بڑے سلیقے سے لپٹی ہوئی کتاب نکال لائیں اور راج میت کے قریب آکر کھڑی ہو گئیں۔

"ہوں۔۔۔۔ یہ تو حساب کی کتاب ہے اور وہ بھی دسویں جماعت کی۔ اتنا

بڑا عمارت ساز! بھلا اس کو کیوں سنبھال سنبھال کر رکھے ہوئے ہے؟" ایک یاد نے اسے چھیڑا اور کھلکھلا کر ہنس دی۔

"پگلی' اس کا پہلا صفحہ تو دیکھ۔ یہ کیا لکھا ہے؟" یہ سن کر تمام یادیں ایک دوسرے سے کتابیں چھین کر پڑھنے کے لئے بے قرار ہو اٹھیں۔

"ستی۔ راج میت" ایک یاد نے اونچی آواز میں پڑھا۔ راج میت کی آنکھیں ایک کرب سے ڈبڈبائیں۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے زندگی بھی ایک حساب کی کتاب ہے' جس پر نہ جانے ستی کی محبت نے اپنا نام کیسے لکھا کہ وہ اب صرف اسی کا نام ورد کرنے لگا اور سب کچھ بھول گیا۔

کمرے میں ایک آہٹ ہوئی۔ نوکرانی نے آکر بتایا کہ لیڈی ڈاکٹر آگئی ہے اور وہ اپنی نرس کے ہمراہ سیدھی میم صاحب کے کمرے میں چلی گئی ہے' ویسے فکر کی کوئی بات نہیں۔

راج میت نے اثبات میں سرہلا دیا اور نوکرانی کمرے سے باہر چلی گئی۔ اب راج میت نے ستی کی یادوں کو جھڑکتے ہوئے کہا "اس کتاب کو میز کی دراز میں مقفل کر کے چلے جاؤ۔"

یادیں مسکرا دیں' جیسے کہہ رہی ہوں "ہم تمہاری نوکر نہیں' ہم کسی کی بھی نوکر نہیں ہم نہ کسی کے کہنے سے آتی ہیں' نہ کسی کے حکم پر واپس لوٹتی ہیں۔"

راج میت نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ ہاتھوں سے چہرے کو یوں پونچھنے لگا۔ جیسے یہ یادیں بھی پسینے کے قطرے ہوں---- پھر اپنی اس حرکت پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ یہ ہنسی' یہ قہقہہ رونے سے زیادہ مشابہہ تھا۔ پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آئی' ایک کاغذ نکالا اور پنسل سے اس نے ایک نقشہ تیار کرنا شروع کردیا۔

نوکرانی ہانپتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی---- جیسے بہت تیز دوڑتی ہوئی آئی ہو "صاحب! صاحب! چھوٹا صاحب----" نوکرانی کے پیچھے پیچھے لیڈی ڈاکٹر بھی تھی۔ نوکرانی نے پردہ ہٹانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ڈاکٹر نے سفید کپڑوں میں لپٹے ہوئے بچے کو بڑھاتے ہوئے کہا "مبارک!"

لیڈی ڈاکٹر کی پھول سی مسکراہٹ ایک دم سوکھ کر کانٹا بن گئی اور یہ کانٹا۔ "مبارک" لفظ کے پاؤں میں چبھ سا گیا۔ ڈاکٹر ستی نے ساری زندگی کی پیاس آنکھوں میں بھر کر راج میت کی آنکھوں میں جھانکا---- ستی کی زبان تو نہیں' لیکن پلکوں پر اٹکا آنسو جیسے بہت اونچی آواز میں کہہ رہا تھا "راج دیکھ میرے ہاتھوں میں وہ بچہ ہے جس کی ماں مجھے بننا تھا۔ لیکن آج میں صرف اس کی دائی----"

راج میت نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو ستی کی طرف بڑھا دیا۔ راج میت کی زبان تو نہیں' لیکن اس کی پلکوں پر اٹکا ہوا ایک آنسو بھی اونچی آواز سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو---- مجھے کبھی اس گھر کا مالک بننا تھا۔ اب میں اس کا عمارت ساز ہوں---- صرف عمارت ساز----"

مونالیزا نمبر 2

پچھلے کچھ برس میں میں نے جو کچھ دیکھا سنا اور جانا ہے اگر اسے کچھ ترتیب سے آپ کے سامنے رکھوں تو ایک طرف کچھ نظمیں رکھ سکتا ہوں---- یعنی کہ انسان کے کچھ سپنے جن کے ہر پنکھ میں کئی رنگ ہوتے ہیں---- اور دوسری طرف قتل کی انسائیکلو پیڈیا---- یعنی انسان کے وہ فعل جن کے ہر پنکھ میں صرف خون کا ایک ہی رنگ رچا ہوتا ہے۔

اور ان دونوں کے بیچ میں مونالیزا کو رکھ سکتا ہوں---- مونالیزا نمبر2 کو۔

میری اس کی جان پہچان کے پہلے روز ہی اس نے اپنا یہ نام رکھا تھا۔ کہنے لگی "ویرا جی کوئی نام بتاؤ۔ مجھے اپنا نام رکھنا ہے"

"ابھی تک تیرا کوئی نام ہی نہیں؟ ہو گا ہی نہیں۔ اسی لئے ابھی تک تو نے اپنا نام مجھے نہیں بتایا"

"میرا نام س سے شروع ہوتا ہے مگر میں چاہتی ہوں میرا نام ایسا ہو جو "ش" سے لے کر "م" تک کے حروف میں کسی سے شروع ہو"

"تیرے خیال کے مطابق "س" سے پہلے جو حروف آتے ہیں، کیا وہ اچھے حروف نہیں ہوتے؟"

"پتہ نہیں، مگر میں نے کہیں پڑھا تھا کہ دنیا کے خاص لوگوں کے نام "س" سے لے کر "م" تک کے حروف والے ہوتے ہیں"

"یہ تو نے کہاں پڑھا تھا؟"

"یاد نہیں، مگر میں نے پڑھا ضرور تھا"

میں نے کہا کچھ نہیں' صرف غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا اس کا چھوٹا سا قد' خوبصورت بھرا بھرا جسم' گورا رنگ' مگر گال جیسے گورے رنگ سے ابھرے ہوئے تھے اور اسی ابھارے کی وجہ سے ہونٹ کچھ لٹکے ہوئے تھے۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس برس کی ہو گی' مگر اس کی عمر کسی کو اپنی طرف کھینچتی سی نہیں لگتی تھی۔ اس کی نظریں مجھ پر نہیں تھیں وہ تو میرے کمرے میں لگی ہوئی تصویر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ تصویر کس کی ہے؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

"اتنی مشہور تصویر تو نے پہلے نہیں دیکھی؟ یہ دنیا کی اس عورت کی تصویر ہے جس کی مسکراہٹ کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا"

"کیا مطلب؟"

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی مسکراہٹ میں اداسی بھی شامل ہے اور کچھ کا کہنا ہے کہ اداسی یا مایوسی بالکل نہیں' اس میں صرف جوانی کی تپش ملی ہوئی ہے یا شاید دنیا پر کوئی طنز اس کی معصوم رازدارانہ مسکراہٹ پر بحث کرتے ہوئے دنیا کو نہ جانے کتنی صدیاں بیت چکی ہیں بہرحال اس کی مسکراہٹ کا مطلب چاہے کچھ بھی ہو مگر یہ ضرور ہے کہ اس کی مسکراہٹ نے دنیا کے لاکھوں آدمیوں کا دھیان اپنی طرف کھینچے رکھا تھا اور اب بھی کھینچے ہوئے ہے"

"اس کا نام کیا تھا؟"

"مونا لیزا"

"مونا لیزا---- میم سے! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بھی اپنا نام مونا لیزا ہی رکھوں گی"

"مونا لیزا؟" میں اس طرح چونک پڑا جیسے اس لڑکی نے میرے دیکھتے دیکھتے میری دیوار پر لگی ہوئی مونا لیزا کی تصویر پھاڑ دی ہو---- نہیں میری دیوار پر لگی ہوئی ایک معمولی تصویر نہیں' مونا لیزا کی اصلی یونارڈو اونچی کی پینٹ کی ہوئی کینوس پھاڑ دی ہو۔

"کیا جو کچھ اپنے پاس نہیں ہے' وہ خریدا نہیں جا سکتا؟" وہ ہنس پڑی۔ میرا مطلب ہے۔ تو وہ مسکراہٹ خرید سکتی ہو"

"ہاں خرید سکتی ہوں" اس نے کہا اور پھر ہنس پڑی۔ وہ یا تو چپ رہتی تھی یا ہنستی تھی چپ رہتی تھی تو اس کے موٹے ہونٹ اس کے منہ پر لگے ہوئے تالے کی طرح لگتے تھے ہنستی تھی تو اس کے چوڑے دہانے میں سے اس کی ہنسی چوپٹ کھلتے دروازوں میں سے یکبارگی بہتی ہوئی لگتی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر کوئی مسکراہٹ کو خریدنے والی بات مان بھی لے تو اس مسکراہٹ کو وہ کن ہونٹوں پر رکھے گی؟ مگر میں اس سے کوئی دل دکھانے والی بات نہیں کہہ سکتا تھا وہ میری آج ہی شناسا بنی تھی اور وہ بھی بڑی مہربان کے روپ میں۔ وہ میرے پاس میری اس کاشنی کا پیغام لے کر آئی تھی جس کا پیغام تو کیا نام سننے کے لئے بھی میرے کان برسوں سے ترس رہے تھے' کئی سال ہوئے کاشنی کے بیاہ کی رات کو اس کا خط آیا تھا کہ اگر میں اسے بھول سکوں تو بھول جاؤں۔ اس کے بعد کاشنی نے کبھی نہیں پوچھا کہ "اگر" کا لفظ استعمال کرتے وقت اس نے اپنی جس یاد کو بھولنے یا نہ بھولنے کے درمیان لٹکا دیا تھا' اس کا کیا بنا؟ اور اب یہ لڑکی مجھے بتا رہی تھی کہ وہ جس سکول میں پڑھاتی ہے آج کاشنی اسی سکول میں اپنی بچی کو داخل کرانے آئی تھی اور پھر پتہ نہیں کیسے باتوں کے ذخیرے میں سے اس نے یہ بات کرید نکالی کہ اس کی بچی کی ماسٹرنی بھی اسی بستی میں رہتی ہے جہاں میں رہتا ہوں---- اس کے کنوارے دنوں کا عشق۔

اس قاصد لڑکی نے مجھے آج پہلی بار دیکھا تھا۔ سڑک پر گزرتے شاید کبھی دیکھا ہو گا' مگر میرے ساتھ بات کر کے اس نے آج پہلی مرتبہ دیکھا تھا---- اور اس کے کہنے کے مطابق آج کاشنی کو بھی اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس کے بات کرنے میں عجیب بے باکی تھی۔ ابھی جب اس نے میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا اور میں حیران سا ہوتا ہوا اسے پوچھنے لگا تھا کہ تم کون ہو' تو کمرے میں گزرتے ہوئے اس نے عجیب بے باکی سے کہا تھا۔ "مجھے آپ کی سالی

بننا تھا' مگر نہیں بن سکی' لہٰذا اب کچھ بھی نہیں" ایک ہی فقرے میں اس نے کاشنی سے بہن یا سہیلی کا رشتہ بھی جوڑ لیا تھا اور میرے ساتھ کاشنی کی شادی کا امکان بھی۔

"مگر تو نے مجھے اپنا نام ابھی تک نہیں بتایا" وہ جانے لگی تھی جب میں نے اس سے یہ بات پوچھی۔

"مونا لیزا---- ابھی آپ کے سامنے میں نے اپنا نام رکھا ہے آپ مونا کہہ کر بلایئے۔ ویسے بھی پہلی مرتبہ میں یہ نام آپ کے منہ سے سننا چاہتی ہوں کیونکہ آپ کے گھر ہی یہ نام رکھا ہے"

مجھے اس کے نام میں دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف اس کے منہ سے کاشنی کی باتیں ایک بار پھر سننا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔ "مونا! تو نے مجھے یہ جو کاشنی کا پیغام دیا ہے اسے پیغام کس طرح نہیں کہا جا سکتا"

"پیغام صرف لفظوں میں ہوتا ہے؟ آنسوؤں میں نہیں ہو سکتا؟ آپ کا نام لیتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ ان آنکھوں کا پانی آپ کو کوئی پیغام نہیں معلوم ہوتا؟"

"مگر اس نے تجھ سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تو میرے پاس آئے اور یہ بات مجھے بتائے"

"پھر وہی بات۔ صرف لفظوں میں ہی کچھ کہا جا سکتا ہے؟"

"مجھے یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میں کاشنی کو پھر اسی شدت سے چاہنے لگوں گا جیسے کبھی چاہا کرتا تھا لیکن میں پریشان ضرور ہو گیا تھا اور میں نے دیکھا کہ مونا غور سے میرے منہ کو تک رہی تھی اس کے ہونٹوں کے پاس ایک چھوٹا سا بل بھی پڑ گیا تھا۔ وہ شاید ہم دونوں کی ان کہی باتوں کو سمجھ لینے کی اور پھر ایک دوسرے کے پاس جا کر کہہ سکنے والی سمجھ کی مسکراہٹ تھی---- اور مجھے محسوس ہوا کہ ابھی یہ مونا لیزا مسکراہٹ کو خریدنے والی جو بات کہہ رہی تھی۔ مجھے اس کے بھید کا پتہ چل گیا ہے میں نے اپنا سر جھکا لیا۔

اس رات میں نے زندگی میں پہلی دفعہ ایک نظم لکھی۔ کاشنی مجھے اس طرح یاد آرہی تھی۔ جیسے کبھی یاد نہیں آئی تھی۔ میری نامراد چھاتی میں ایک عجیب سی ہوک اٹھی تھی کہ کاش میری یہ نظم مونا لیزا کاشنی کو پڑھوا دے---- تمہارا ذکر سن کر اگر کسی کی آنکھوں میں آنسو آجائیں تو اس کا مطلب ہے کہ تم ابھی تک کسی کے دل میں جیتے ہو' پتہ نہیں انسان اپنے جیتے رہنے کا یہ ثبوت کیوں مانگتا ہے' جیسے اپنے آپ میں زندہ ہونا کافی نہیں ہوتا---- میں تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ کاشنی نے میری یہ نظم پڑھی ہے اور یہ نظم ایک جلتے کوئلے کی طرح اس کے دل میں پڑ گئی ہے اور اس کوئلے کی آگ سے اس کے دل میں پڑے ہوئے برسوں کے بجھے ہوئے کوئلے پھر سلگ پڑے ہیں---- ویسے مونا کے سکول میں جا کر اسے ڈھونڈنا اور یہ بات کہنا بھی پاگل پن لگ رہا تھا۔

میں مونا کے سکول نہیں گیا۔ تین روز گزر گئے۔ چوتھے روز مونا آئی۔ میں ابھی ہوٹل سے روٹی کھا کر آیا تھا اور اپنے کمرے میں آکر بجلی کی انگیٹھی پر کافی بنا رہا تھا۔ کسی برسوں کے شناسا کی طرح مونا نے آتے ہی میرے ہاتھوں سے کافی کا ڈبا لے لیا۔ پیالیاں گرم پانی سے دھوئیں اور کافی بنا کر میز پر رکھ دی۔

"ویرا جی آپ کی طبیعت شاید ٹھیک نہیں" مونا نے کافی کا پہلا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ مونا نے پہلے دن آتے ہی مجھے "ویرا جی" کہہ کر بلایا تھا۔ مجھے ایسے جذباتی لفظوں سے کبھی لگاؤ نہیں رہا۔ جلدی سے کسی کو ماتا جی یا بہن جی کہنا مجھے ہمیشہ بڑا اوٹ پٹانگ سا لگتا ہے۔ مونا کے منہ سے پہلے روز تو نہیں مگر آج یہ لفظ سن کر مجھے برا نہیں لگا۔ کچھ اچھا ہی لگا۔ شاید اس لئے کہ اس لفظ کی سادگی سے میری اور اس کی واقفیت کی راہ اتنی آسان ہو جاتی تھی کہ میں اس کے ساتھ کاشنی کی باتیں بے جھجک کر سکتا تھا اور واقفیت کی اس آسان راہ میں کسی بھلاوے کا اندھا موڑ نہیں آسکتا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ مونا نے ضرور میری ہی طرح سوچا ہو گا۔ اس کی یہ دور اندیشی مجھے اچھی لگی۔ میں کافی پیتے ہوئے اسے نظم سنانے لگا۔

دوسرے یا تیسرے روز مونا پھر آئی---- اور پھر تو جیسے ایک سلسلہ بن

گیا۔ میں انتظار کے دوران کوئی نظم ضرور لکھتا۔ مونا کو سناتا وہ نظم مانگ لیتی اور ہنس کر کاشنی کی کوئی نہ کوئی بات ضرور سنا جاتی۔ کبھی کہتی، "میں نے آج کاشنی کے بچے کے ہاتھ کاشنی کو پیغام بھیجا تھا کہ بچے کی پڑھائی کے بارے میں مجھے کوئی بات کرنی ہے، اس لئے وہ سکول آجائے" کبھی کہتی، "آج کاشنی خود ہی سکول آگئی تھی، اسے بچے کو آدھے دن کی چھٹی دلا کر لے جانا تھا" اور پھر وہ بتاتی کہ کاشنی کیسے مونا سے اپنے بچے کی بات کرتی، کیسے اس کے کالے بٹوے کی طرف دیکھتی رہتی تھی، کیسے ترس کر سوچتی رہتی کہ آج اس لئے کوئی اور نظم بھیجی گئی ہے یا نہیں۔ ایک دن مونا نے مجھے یہ بھی بتایا کہ کاشنی مجھے ایک خط لکھ رہی تھی، لیکن بھیجنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی، ایک دن یہ حوصلہ بھی پیدا ہو ہی جائے گا۔

جس مکان میں میں نے ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ مکان کے مالک اسی مکان کے نیچے کے حصے میں رہتے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن مونا کا میرے کمرے میں آنا اب تک مکان مالکن کو ضرور کھلنے لگا ہو گا۔ یہ بات میں خود بھی سوچتا تھا اور مونا سے کہنا بھی چاہتا تھا۔ مگر کہتا اس لئے نہیں تھا کہ مونا کو اگر یہاں آنے سے روک دوں تو اس کے سکول جا کر یا کسی گلی کے موڑ پر کھڑے ہو کر اس سے کاشنی کی خبر پوچھنا یا بتانا مجھے اس سے بھی زیادہ دشواری میں ڈال دے گا اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ مونا کے پاس کون سے دکھ کی دوا نہیں تھی۔ کیونکہ چند دن بعد ہی میں نے دیکھا کہ مونا کے لئے میری طرح مکان مالکن کی لڑکی بھی انتظار کرنے لگی۔ خود مکان مالکن راہ دیکھنے لگی۔ لڑکی کی شادی شاید جلد ہونے والی تھی۔ مونا اس کے ساتھ بیٹھ کر کتنی کتنی دیر تک اس کے کپڑوں میں گوٹا کناری لگاتی اور رسوئی میں اس کے پاس بیٹھ کر سبزی بناتی۔ ایک روز میں نے یہاں تک دیکھا کہ بیاہ والی لڑکی بیمار تھی۔ ماں کے ہاتھ میں سبزی کاٹتے وقت چاقو لگ گیا تھا اور شاید جھوٹے برتن مانجھنا ضروری تھا تو مونا رسوئی میں بیٹھ کر بڑی بے تکلفی سے برتن بھی مانجھنے لگی تھی۔

"ایسی لڑکیاں آج کل کہیں نہیں ہوتیں۔ کسی خوش نصیب ماں کی بیٹی ہے"

مکان مالکن زینے پر چڑھتے ہوئے میرے پاس آکر کہنے لگی اور مونا نے بھی اندر سے آواز دے کر کہا۔ "میں ابھی آئی ویرا جی" جیسے زور سے مجھے "ویرا جی" کہہ کر اور مکان مالکان کو سنا کر اس نے آئے دن میرے کمرے میں آنے اور بیٹھنے کا راستہ نکال لیا تھا یوں وہ میرے کمرے میں آکر بھی مجھے ویرا جی ہی کہتی تھی۔ مگر کبھی کبھی ایسے لفظوں کو زور سے اور دوسروں کے سامنے کہنا شاید ضروری ہو جاتا ہے۔ مجھے مونا کی یہ سوجھ بوجھ اچھی لگی۔

راستہ پلٹوں کی مدد کرنے کی مونا کو لگن سی تھی۔ ایک عجب سا درد مونا کے دل میں چھوٹی سی عمر میں ہی سما گیا تھا۔ ایک رات اپنے درد کا راز اس نے مجھے خود اپنی زبان سے بتایا۔ رات کافی ہو گئی تھی۔ میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ مونا اندر آئی۔ اس کے چہرے کا رنگ کسی نچڑے ہوئے کپڑے کی طرح تھا۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے تھے اور کانپ رہے تھے۔ میرا بازو تھام کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور کانپتی لرزتی دیوان پر بیٹھ گئی۔

"ویرا جی---- "کپکپاتے ہونٹوں سے اس نے بمشکل تمام کہا اور نڈھال ہو کر اوندھی سی گر گئی۔ میں نے اس کو دو کمبل اوڑھائے اور کتنی ہی دیر تک اس کے بازو دباتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہوش میں نہیں ہے میں نے چائے بنائی۔ اسے کندھے کا سہارا دے کر بٹھایا۔ چائے پلائی اور کچھ گھبراہٹ کے ساتھ اس سے کہنے لگا کہ وہ ہمت کرے، سنبھل کر مجھے بات سنائے اور پھر میں اس کے ساتھ جا کر گھر چھوڑ آؤں گا۔

"میں بڑی بدنصیب ہوں" اس نے رو کر کہا اور بعد میں آدھے ٹوٹتے ہوئے فقروں میں اس نے جو کچھ مجھے سنایا وہ واقعی خوف ناک تھا---- وہ ان دنوں بچی تھی---- مشکل سے بارہ برس کی، جب اس کے سگے باپ نے اس سے اپنا منہ کالا کیا تھا۔ اس کا باپ مر گیا تھا۔ آج اس کی ماں گھر پر نہیں تھی۔ گھر میں اکیلی تھی۔ اس کا سگا چاچا پردیس سے آیا تھا۔ چاچا کو روٹی کھلا کر وہ اپنے کمرے میں پہنچی ہی تھی کہ اس کا چاچا اس کے کمرے میں آکر زبردستی----

اس رات کے بعد میں نے نفسیات کی کئی کتابیں لا کر پڑھیں اور مونا کو بھی پڑھائیں میری تمنا تھی کہ مونا جیسی اچھی لڑکی کے دل پر سے اگر اس کے زخموں کے کھرنڈ اتر سکتے ہوں تو اتر جائیں۔ میں چاہتا تھا اس کا کنوارا من پھر شاداب ہو جائے۔

ایک دن ایک امریکی اخبار میں مونا نے امریکن پولیس کا ایک اشتہار پڑھا۔ جس میں دس قاتلوں کی تصویریں اور ان کی زندگی کے کچھ حالات دیئے گئے تھے اور اعلان کیا گیا تھا کہ جیل سے بھاگے ہوئے ان دس قاتلوں کی پولیس کو سخت ضرورت ہے۔ اشتہار شاید کسی رنگین مزاج جرنلسٹ کا لکھا ہوا تھا۔ عبارت بڑی چٹپٹی تھی۔ مونا مجھے ایک ایک قاتل کی تصویر دکھانے کے بعد پڑھ رہی تھی۔ "سنو ویرا جی' یہ ایڈورڈ ٹیپس کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ اس کی تصویر دیکھی ہے؟ دیکھنے میں پیرس کا آرٹسٹ لگتا ہے۔ لکھا ہوا ہے۔ اس نے سب سے پہلے اپنی بیوی کو قتل کیا۔ پھر کئی اور عورتوں کو۔ مگر یہ صرف ان عورتوں کو قتل کرتا ہے جن کی عمر چالیس برس سے زیادہ ہو۔" مونا ہنس رہی تھی۔ اسے جیمس ایڈورڈ کینڈی کو دیکھو۔ پولیس نے اسے تلاش کرنے کے لئے یہ نشانی بتائی ہے کہ اس کے بائیں ہاتھ پر ایک لفظ گدا ہوا ہے۔ معلوم ہے کیا لفظ "لو" (Love)"

مونا ہنسے جا رہی تھی اور ہنستے ہنستے پڑھ رہی تھی اور پھر مجھے یاد ہے کہ کسی قاتل کے بارے میں خبر پڑھتے ہوئے اس نے پڑھا کہ اس قاتل نے چھ قتل کئے تھے اور مجھے یاد ہے کہ میں چونک کر رہ گیا تھا جب آگے مونا نے اپنی طرف سے کہا۔ "اسے چھ قتل نہیں کرنے چاہئیں تھے۔سات کرنے چاہئیں تھے کیونکہ سات نمبر لکی ہوتا ہے"

یہ سوچ کر مجھے کچھ اطمینان بھی ہو رہا تھا کہ اب مونا چاچا کا ذکر کرتی تھی تو اس طرح نہیں گھبراتی تھی جیسے اس رات گھبرائی تھی۔ ایک روز اس نے ایک کتاب میں ایک کیس پڑھا کہ ایک خوب صورت لڑکے نے پہلے اپنی ایک بہن کے ساتھ ناجائز تعلق رکھا اور پھر اسے اور اس کے بچے کو مار کر دوسری بہن پر ڈورے

ڈالے۔ اس کی تین بہنیں تھیں۔ تینوں بہنوں کو اس نے باری باری قتل کر دیا تھا۔ یہ کیس پڑھ کر مونا نے خدا کا شکر کیا تھا کہ وہ ابھی تک زندہ ہے اسے نہ اس کے باپ نے قتل کیا تھا اور نہ اس کے چاچا نے---- مونا کی باتوں سے میں دیکھ رہا تھا کہ روز بروز اس کے دل کے زخم بھرتے جا رہے تھے۔

ایک دن صبح کے دھندلکے میں میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ مکان مالک کی لڑکی دروازے کے باہر کھڑی تھی۔ مجھے پچھلے دو مہینے سے پتہ تھا کہ وہ بیمار ہے مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنی بیمار ہے۔ اس کی شادی میں صرف پانچ دن رہ گئے تھے اور اس کی پیاز کے چھلکے کی سی شکل دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ پانچ دن میں یہ لڑکی ڈولی میں کیسے بیٹھے گی۔ وہ پہلے کبھی میرے کمرے میں نہیں آئی تھی۔ پہلی دفعہ آئی تھی اور بڑی جھجکی سمٹی کھڑی تھی۔

"کیوں رکشہ؟" لفظ میرے منہ میں ہی تھے کہ رکشہ نے منت سے کہا۔

"مونا دو دن سے نہیں آئی۔ میں کبھی اس کے گھر نہیں گئی۔ ان دنوں جا بھی نہیں سکتی۔ آپ جیسے بھی بنے اس کو بلا دیں"

"اس کے گھر تو میں بھی کبھی نہیں گیا۔ شاید تیسرے بلاک میں رہتی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ یہاں ہو گی نہیں۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹی لے کر اپنی کسی موسی کے پاس گئی ہے"

"ایک---- ہفتہ---- کے---- لئے----" رکشا گھبرا کر وہیں دہلیز پر بیٹھ گئی۔

"تجھے بہت ضروری کام تھا؟" میں نے پوچھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

رکشا نے پھیلی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا---- میری طرف بھی نہیں، خلا میں۔ رکشا کے جسم سے خون بہتا ہوا نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا تمام خون بہہ کر کہیں چلا گیا تھا اور صرف خون سے خالی جسم رہ گیا تھا۔

"میں---- مر---- جاؤں گی ---" رکشا نے تڑپ کر کہا۔

"پانچ دن میں تیرا بیاہ ہے رکشا!"

"اس روز---- میری---- ارتھی---- اس گھر سے نکلے گی"

رکشا کی بات سن کر میں نے جو اندازہ لگایا- میرا خیال ہے وہی اندازہ لگایا بھی جا سکتا تھا- میں نے سوچا جہاں رکشا کی شادی ہو رہی ہے- وہ وہاں شادی نہیں کرنا چاہتی- غم میں گھلتی ہوئی وہ پچھلے دو مہینے سے کھاٹ پر پڑی تھی- مگر یہ بات میری عقل میں نہیں آرہی تھی کہ مونا کو اس سلسلے میں اس کی کیا مدد کرنی تھی---- شاید اس شخص کو سمجھا بجھا کر لانا تھا- جس سے رکشا پیار کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ شادی سے رکشا کو بچا لے-

"میں سمجھ سکتا ہوں' رکشا! تیری یہ شادی تیری مرضی سے نہیں ہو رہی---- "میں" یہی کہہ سکتا تھا-

"نہیں راکیش صاحب' یہ بات نہیں- شادی میری مرضی سے ہو رہی ہے-" رکشا بلک اٹھی-

"پھر----؟"

"کچی عمر میں غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں ویرا جی! مونا آپ کو ویرا جی کہتی ہے---- میں بھی کہہ لوں؟ آپ کو سگے بھائی سے بڑھ کر سمجھوں گی' اگر----

گھبرائی ہوئی رکشا نے میرے پیروں کی طرف ہاتھ بڑھایا- میں نے اس کا ہاتھ روک لیا- اس نے ایک دفعہ سیڑھیوں کی طرف دیکھا- جیسے دیکھ رہی ہو کہ اس کی بات کسی اور کے کان میں تو نہیں پڑی- پھر ڈر اور پچھتاوے کے لہجے میں کہنے لگی-

"سامنے کے مکان میں ایک لڑکا دیوی کمار رہتا ہے- اب ایم اے میں پڑھتا ہے مجھے وہ اچھا لگتا تھا- ڈھائی تین برس کی بات ہے' میں انجان تو تھی ہی اسے کچھ چٹھیاں لکھ بیٹھی- چٹھیاں اس نے بھی لکھی تھیں- بات کوئی بڑی نہیں تھی- وہ کہتا ہے کہ میری تمام چٹھیاں شادی والے روز میرے "ان" کو دکھائے گا---- اس سے تو میں مرجاؤں تو اچھا ہے----"

میں نے دیوی کمار کو دیکھا تھا- تھوڑا سا جانتا بھی تھا- مگر دیکھے ہوئے چہروں کے پیچھے ان دیکھے چہرے بھی ہوتے ہیں- میں نے رکشا کو ڈھارس بندھائی کہ میں

دیوی کمار سے ملوں گا اور اسے سمجھاؤں گا۔ مگر رکشا نے جو بات آگے بتائی اسے سن کر مجھے ایسا لگا کہ میں دیوی کمار کو کچھ بھی نہ سمجھا پاؤں گا۔ رکشا نے بتایا کہ اس نے چٹھیوں کے بدلے میں اس سے دو ہزار روپے مانگے تھے۔ وہ روپیہ نہیں دے سکتی تھی۔ اس لئے اس نے ماں کے صندوق میں سے ایک بڑا سا سونے کا گوکھرو چرا کر مونا کے ہاتھ اسے بھیج دیا تھا۔ جواب میں مونا کو وہ چٹھیاں لا کر رکشا کو دینی تھیں۔ مگر چٹھیاں ابھی تک اسے نہیں ملی تھیں اور شادی میں پانچ دن باقی رہ گئے تھے۔

"رکشا تو مجھے دیوی کمار کا خط دکھا سکتی ہے جس میں اس نے تجھے یہ دھمکی دی ہے کہ وہ ---"

"ویرا جی ایسی دھمکیاں کوئی لکھ کر نہیں دیا کرتا ہے۔ اس نے زبانی کہا تھا کہ وہ ----"

"وہ تجھ سے کب ملا تھا؟"

"مجھے نہیں ملا۔ اس نے مونا کے ہاتھ کہلا بھیجا تھا"

پتہ نہیں کتنے خیال میرے دماغ میں آئے اور گئے۔ مگر رکشا کو بچانا ضروری تھا۔ میں نے ایک پیالی کافی پی۔ دفتر جانے سے پہلے دیوی کمار کے گھر پہنچا اور اسے بلا کر نہرو والی سڑک پر لے گیا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ میں بات کو سیدھی کرنے کے بجائے اور الٹی نہ کر دوں۔ جو شخص کسی لڑکی سے دو ہزار روپے مانگ سکتا تھا' وہ مجھے بھی کسی الجھن میں ڈال سکتا تھا۔

عجیب حالت تھی۔ میں دیوی کمار پر شک کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر شک کرنے کی کوئی گنجائش بھی نہیں مل رہی تھی۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے بات شروع کی۔ میں کسی بچکانے سخت اور میرے اوپر ہی کوئی الزام لگانے والے جواب کو سننے کی امید میں میں اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کتنی ہی دیر تک اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں چبا کر' آنکھوں میں امڈتے ہوئے آنسوؤں کو روک کر مجھ سے کہا۔ "مجھے کوئی اتنا برا بھی سمجھ سکتا ہے' یہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

انسان کا دل کسی بھی رو میں بہہ سکتا ہے۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ شاید دیوی کمار میرے منہ پر بات ٹالنے کے لئے یہ سب کچھ کہہ رہا ہے تاکہ میں رکشا کو جا کر اطمینان دلا دوں اور جب وہ بے فکر بیٹھی ہو تو آج سے پانچویں دن اس کے لئے موت کا فرشتہ بن کر پہنچ جائے مگر خیال کی یہ رو بھی دیر تک نہ رہی۔ دیوی کمار کے کہنے کے مطابق اسے چٹھیوں والی بات کا خیال بھی نہ تھا۔ وہ چٹھیاں تو اس نے ان ہی دنوں پھاڑ دی تھیں۔ مونا نام کی لڑکی سے کبھی ملا ہی نہیں تھا' نہ اس نے مونا کے ذریعہ رکشا کو کوئی دھمکی دی تھی۔ نہ کوئی سونے کے زیور لے کر اس کے پاس آیا تھا۔ دیوی کمار نے مجھے یقین دلانے کے لئے یہاں تک کہا کہ اگر میں چاہوں تو اسے ایک ہفتہ کے لئے اپنے کسی دوست کے مکان پر قیدی کی طرح رکھ لوں' تاکہ شادی والے دن کسی قسم کے خطرے کا اندیشہ نہ رہے۔

اب کیا ہو سکتا تھا؟ میرے لئے صرف راہ تھی کہ دیوی کمار کی بات پر یقین کر لوں۔ یا یہ ہو سکتا تھا کہ مونا کو کہیں سے ڈھونڈ کر دیوی کمار کے سامنے لاؤں اور بات کی تہ تک پہنچوں۔

مونا کا مکان ڈھونڈ کر میں اس کے یہاں پہنچا۔ دیوی کمار بھی میرے ساتھ تھا۔ مونا کی ماں نے جیسے ہی مجھے دیکھا۔ بڑے پیار سے اندر آنے اور بیٹھنے کے لئے کہا۔ جیسے وہ مجھے جانتی ہو۔ شاید اس نے مونا کے منہ سے میرا ذکر سنا ہو گا۔

"میں تو بیٹے خود ہی سوچتی تھی کہ تیرے گھر جاؤں۔ تیرے آگے جھولی پھیلا دوں---- مونا کی ماں نے جب مجھے کمرے میں بٹھا کر اور خود میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا تو میں سر سے پاؤں تک ہل سا گیا۔ میں ہڑبڑا کر بولا "معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے مجھے غلط پہچانا ہے"

"تن بوڑھا ہو جاتا ہے بیٹے! نظر بوڑھی نہیں ہوتی۔ میں نے تجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ راکیش نام ہے نا تیرا؟ میں نے تیری تصویر دیکھی ہے" اس نے جب یہ کہا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک مرتبہ مونا کو ایک تصویر دی تھی---- مونا کو نہیں' مونا کے ہاتھ کاشنی کو اور میں سوچنے لگا کہ مونا نے میری وہ تصویر اپنی ماں کو

دکھائی ہو گی۔

"تیرے نام کی مالا جپتی ہے۔ تیری بھگتن بن گئی ہے۔ میں اس کے دل کی بات نہیں سمجھوں گی بھلا؟ جو کتاب وہ روز رات کو پڑھتی ہے۔ تیری تصویر اس نے اسی کتاب میں رکھ چھوڑی ہے"

"میری تصویر!" مجھے نہیں، میرے سپنوں کو ایک چوٹ سی لگی اور میں سوچ میں پڑ گیا کہ مونا نے میری تصویر ابھی تک کاشنی کو کیوں نہیں دی تھی۔

"یہ دیکھ بیٹا! میں چاہے دور کھاٹ پر سوئی ہوتی ہوں مگر جتنی دیر تک آنکھ نہیں لگتی۔ یہ تاڑ لیتی ہوں کہ وہ ایک دو صفحے پڑھتی ہے اور پھر کتنی ہی دیر تک تصویر کو دیکھتی رہتی ہے۔ "یہ کہہ کر وہ ایک صندوقچی لے آئی اور اس میں سے ایک کتاب نکالتے ہوئے بولی، کتاب تو انگریزی کی ہے۔ پتہ نہیں کیا ہے اس میں، مگر وہ اسے باقاعدہ گیتا کی طرح پڑھتی ہے"

میں نے کتاب ہاتھ میں لی اور کتاب سمیت میرا ہاتھ ٹھٹھک گیا۔ "قتل کی ان سائیکلو پیڈیا"---- کتاب کا نام دیوی کمار نے بھی پڑھ لیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے اس کی طرف۔

کتاب میں میری تصویر رکھی ہوئی تھی---- اس طرح جیسے صفحہ تلاش کرنے کی نشانی رکھی ہو۔ کسی کسی صفحہ پر کسی جملے کے نیچے لال پنسل کی لکیر تھی۔ ایک لکیر والا جملہ میں نے پڑھا۔ لکھا تھا، چھ قتل وہ کر چکا تھا۔ ساتواں قتل اس نے صرف اس لئے کیا تھا کہ اس کے خیال کے مطابق سات نمبر لکی ہوتا ہے۔

پچھلے کتنے ہی دن تتلیوں کی طرح میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے اور پھر لال لکیر والا جملہ میں نے پڑھا۔ یہ کتاب کے دیباچہ میں لکھا تھا۔ اس بات کی کوئی سائنٹیفک وجہ تو نہیں مگر ہے یہ عجیب بات کہ جو قاتل بہت مشہور ہوئے ہیں ان کے نام اکثر "س" سے لے کر "م" تک کے حروف سے شروع ہوتے ہیں---- اور میرے کانوں میں گونجنے لگا مونا لیزا---- میرا نام س سے شروع ہوتا ہے مگر میں چاہتی ہوں کہ میرا نام ایسا ہو جو س سے لے کر م تک کے کسی

حروف سے شروع ہو۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری زبان میرے منہ میں لکڑی کی طرح سوکھتی جا رہی ہے اس وقت میرے چہرے پر ظاہر ہے خوشی کی جھلک نہ ہو گی۔ اس نے بھی دیکھا ہو گا۔ میری تصویر میرے ہاتھ میں تھی اس نے کچھ نہیں کہا۔ بس یاد کرنے لگی---- شاید صرف باتیں کرنے کے لئے "اپنی ہمت سے ہی اتنی پڑھ لکھ گئی ہے۔ نہیں تو سر پر باپ نہیں ہے کون پڑھاتا؟" باپ کا ذکر سنتے ہی میرے دل میں خراش سی پڑ گئی۔ میں نے پوچھا۔ "جب اس کے پتا جی چل بسے تو وہ کتنے برس کی تھی۔

"جانے کس جنم میں میں نے پاپ کیا تھا بیٹا! ادھر یہ لڑکی کی گود میں آئی اور ادھر اس کا باپ چل بسا---- " وہ پلو سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہنے لگی۔ پیروں کے نیچے سے زمین نکلنے کا محاورہ میں نے سن تو رکھا تھا۔ مگر اس وقت مجھے سچ مچ ایسا لگا کہ میرے پیروں کے نیچے سے نکل کر پتہ نہیں زمین کہاں چلی گئی ہے۔ کسی زمین کو سنبھالنے کی کوشش میں میں نے کہا۔ مشکل سے دس بارہ سال کی ہو گی جب اس کا باپ----

"دس بارہ برس کی کہاں بیٹا۔ دس بارہ مہینے کی۔ اسے تو باپ کا ہوش بھی نہیں"

مجھے محسوس ہوا کہ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل تو گئی تھی۔ مگر مجھے کوئی اور زمین مل گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم نے بڑی مصیبت کے دن دیکھے ہوں گے؟ اس کے چاچا تاؤ نے پالا اور پڑھایا ہو گا!"

"نہ کوئی آگے' نہ کوئی پیچھے۔ ادھر اس کے ننھیال میں کوئی ماما نہیں۔ ماما کو بڑی ماما ہوتی ہے بیٹے! ادھر اس کے باپ کے خاندان میں بھی نہ کوئی چاچا نہ تاؤ۔ تاؤ بھی ہو تو ناک رکھنے کے لئے کچھ کرتے ہی ہیں نا!"

وہ پلو سے ابھی تک آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دیوی کمار بھی کھڑا ہو گیا۔

"بیٹا بغیر ہو منہ جھوٹا کئے ہی چل دیئے؟ کچھ منٹ بیٹھ جاؤ۔ میں چائے بنائے

لاتی ہوں" بات اس کے منہ میں تھی کہ میں دہلیز پر تھا۔

اس کے بعد مجھے پتہ نہیں کہ مونا کب اپنی موسی کے گاؤں سے آئی ہو گی۔ اس کی ماں نے اس سے کیا پوچھا اور کیا بتایا ہو گا۔ مونا پھر مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ رکشا کی شادی ہو گئی۔ مگر کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ صرف گھر میں ایک کھلبلی سی مچ رہی تھی کہ گھر میں سے کسی بھیدی نے سونے کا گوکھرو چرا لیا ہے۔ رکشا چپ رہنا چاہتی تھی۔ مونا کو دیئے ہوئے گوکھرو والی بات بتاتی تو پوری بات بتانی پڑتی۔ وہ یہی شکر کر رہی تھی کہ گوکھرو کھو کر اس کی جان تو آفت سے بچی۔ دیوی کمار ویسے رکشا کو کوئی پیغام یا تحفہ شاید نہ دیتا مگر اب یہ دکھانے کے لئے کہ اس کے دل میں کوئی رنجش نہیں ہے۔ اس نے میرے ذریعے ایک گھڑی اور کچھ کتابیں رکشا کو بھیجیں۔

میں مونا سے ایک دفعہ ملنا چاہتا تھا۔ ایک ایک بات پوچھ کر اس کے چہرے کا رنگ دیکھنا چاہتا تھا۔ مونا لیزا کے چہرے کا رنگ۔ پھر سنا کہ مونا کی شادی ہو گئی۔ یہ خبر مجھے مکان کی مالکن نے بتائی تھی۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے یہ بھی کہا "لوگ تو تل کا پہاڑ بنا لیتے ہیں کہتے ہیں اسے دن چڑھے ہوئے تھے اس لئے راتوں رات اس کے پھیرے ڈال دیئے گئے کیا پتہ سچ ہی ہو اس لئے کہ سنا ہے شوہر بڑی عمر کا ہے ویسے کہتے ہیں بڑی زمین کا مالک ہے لوگوں کو جلن بھی تو بہت ہوتی ہے کسی کو خوش دیکھ کر خوش نہیں ہوتے" اور اس کے بعد وہ مجھے گھورتے ہوئے کہنے لگی۔ "تجھے بھی اس نے بیاہ کی خبر نہ دی؟ ویسے تو ویرا جی' ویرا جی' کہتے ہونٹ سوکھتے تھے۔

کچھ مہینے بیت گئے۔ ایک دن مکان مالکن نے مجھے دفتر سے آتے ہوئے دروازے پر ہی روک لیا اور دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہنے لگی۔ "تو نے کچھ سنا ہے؟ میں نے تو پرلے کی بات سنی ہے۔ کل جگ ہے کل جگ!" اس نے اپنی بات میں ابھی تک مونا کا نام نہیں لیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اسی کی بات کہہ رہی تھی کہنے لگی "آنکھوں سے دیکھا نہیں مگر سنا ہے کہ دروازے گھستے ہی' حویلی اس نے اپنے نام لکھوا لی تھی' پتہ نہیں اسے کیا دکھ تھا کہ پرسوں اپنے سوتے ہوئے شوہر کے ٹکڑے کر ڈالے۔ پھر کہتے ہیں کہ لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ساری رات

ٹکڑے کاغذوں میں باندھی رہی۔ رنگین کاغذوں پر اس نے چاندی کے ورق لگائے اور ٹوکرے میں اس طرح رکھ لئے جیسے پنڈیاں رکھی ہوں۔ صبح کو جب نوکر چاکر جاگے تو ان سے کہنے لگی کہ شاہ جی ہی کہیں باہر چلے گئے ہیں۔ پھر موٹر میں ٹوکرے رکھوا کر وہ خود ہی موٹر چلا کر کہیں چلی گئی۔ شاید کسی کنوئیں یا کھائی میں پھینکنے گئی ہو گی۔ کم بخت نے چاندی کے ورق اس لئے لگائے ہوں گے کہ گھر کے نوکروں کو کوئی شک نہ ہو۔ دوپہر کے وقت لوٹ آئی۔ دو دن تک تو کسی کو شک نہیں ہوا۔ مگر خون کہاں چھپتا ہے؟ سات پردوں میں بھی بولتا ہے۔ شاہ جی باہر سے لوٹ کر ہی نہیں آئے۔ پھر پتہ نہیں منشی منیموں کو شک ہو گیا۔ کسی نے پولیس کو خبر دے دی اور پھر کہتے ہیں کہ پولیس نے کچھ چیلیں دیکھیں جن کی چونچوں پر ورق لگے ہوئے تھے پولیس نے وہ پورا علاقہ چھان مارا جہاں چیلیں بار بار اڑتی تھیں اور پھر جو ڈھونڈھنا تھا ڈھونڈ لیا۔ پولیس دروازے پر آ بیٹھی۔ پولیس کے ہاتھوں سے بچ کر چنڈال کہاں جاتی۔ اس نے اندر گھس کر کنڈی لگا لی اور پتہ نہیں کیا پھانک لیا۔ پولیس نے جب دروازہ توڑ کر اسے نکالا تو وہ مرنے کے قریب تھی۔ پولیس والے اسے ہسپتال لے گئے۔ پتہ نہیں بچتی ہے کہ نہیں۔ ویسے بھی پورے دنوں سے تھی۔

اس کی ماں کو خبر دینے آج کوئی منشی آیا تھا۔ تمام باتیں پڑوسیوں کو بھی سنا گیا ہے۔ صبح اخباروں میں بھی یہ بات آجائے گی۔۔۔۔"

بات اخباروں میں آنی تھی آگئی' اور پھر یہ بھی آگئی کہ وہ ہسپتال میں مر گئی تھی۔ اس بات کو بھی کتنے ہی دن گزرے چکے ہیں۔ مگر کبھی بیٹھتا ہوں اور سوچتا ہوں تو میرے سامنے ایک طرف میری وہ نظمیں آجاتی ہیں جو میں نے کاشنی کے لئے لکھی تھی۔ یا یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو مونا نے کاشنی کے نام پر مجھ سے لکھوائی تھیں۔ اور ایک طرف قتل کی انسائیکلو پیڈیا کا نیا ورق تھا جو اس کتاب سے باہر ہے پھر بھی اس کتاب ہی میں ہے اور ان دونوں کے بیچ میں رہ جاتی ہے۔۔۔۔ مونا لیزا' نہیں مونا لیزا نمبر 2' اور اس کی وہ تمام باتیں جنہیں وہ خود ہی گڑھتی تھی اور آپ

ہی سناتی تھی اور پھر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کسی کی حیرانی اور پریشانی کو دیکھ کر وہ مسکرانا چاہتی تھی ---- مونالیزا جیسی مسکراہٹ۔

نہیں ---- معصوم رازدارانہ مسکراہٹ نہیں، خوف ناک راز دارانہ مسکراہٹ!

اپنے اپنے چھید

کسی کو معلوم نہیں تھا۔ سوائے خدا کے اور ڈاکٹر راؤ کو کہ شینا نے اپنے سینے میں ایک چھید چھپا رکھا ہے۔

جس دن ڈاکٹر راؤ نے دریندر کے ایکسرے سامنے رکھ کر اس کی بیوی کو علیحدگی میں بلا کر کہا میں نہیں کہہ سکتا' دریندر کی زندگی کے کتنے دن اور باقی ہیں ہو سکتا ہے کچھ مہینے گزر جائیں' لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ چند دن..... دل کے چاروں طرف جو کنکیشنگ والوز ہوتے ہیں' ان میں سے ایک والو میں ایک چھید ہے۔ جو چند ہفتے پہلے کے ایکسرے میں بے یقینی میں ڈالنے والا باریک سا چھید تھا۔ اس بار کے ایکسرے میں یقین ایسا وسیع تھا۔ ڈاکٹر راؤ نے سرد کاروباری لہجے میں کہا: اگر یہ چھید اسی طرح باریک رہتا تو اس سے تھکاوٹ تو رہتی لیکن ہو سکتا تھا وہ کئی برس زندہ رہتے لیکن----!

ڈاکٹر کو "لیکن" کے آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ شینا نے جان لیا کہ چھید بڑھ رہا ہے اور اس چھید میں دریندر کے سانس گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نے جب ڈاکٹر سے کہا' اگر تقدیر نے حملہ آور ہونا ہی ہے تو ایک کام کریں آپ خاموش رہیں جیسے آپ کئی ماہ سے ہیں۔ آپ دریندر سے کچھ نہیں کہیں اب چاہے چند سال باقی ہیں یا نہیں..... میں ان کی آخری سانس تک ان کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ جیسے ہمیں باہم قیامت تک زندہ رہنا ہے..... یہ سن کر ڈاکٹر راؤ جان گئے۔ شینا نے اپنے سینے میں ایک ایسا چھید چھپا لیا ہے جسے دنیا کے کسی ایکسرے میں نہیں دیکھا جا سکتا۔

تیسری عورت آرٹیکل نمبر۵ اپنے اپنے چھید

شینا نے جان لیا تھا کہ موت اس کے گھر کا پتہ پوچھ رہی ہے۔ لیکن سوچا جب تک اسے گھر نہیں ملتا اور جتنے روز موت دروازے پر دستک نہیں دیتی تب تک تو اسے اپنا گھر اور دریندر کے ساتھ ایسے جینا چاہئے جیسے صرف ایک مرد اور عورت نے دنیا کا پہلا گھر بسایا تھا۔

دریندر کو یہ بالکل معلوم نہ تھا کہ موت اسے جلد سے جلد نمٹا رہی ہے۔ اس کے دل میں کیا آئی اس نے سب کچھ کر کرا کے اپنے لئے یہ گھر خرید لیا تھا۔ شینا سوچتی رہی۔ صرف پانچ برس کی نوکری سے بچے ہوئے پیسے تھے اس نے کچھ تھوڑی سی والدین اور دفتر سے مدد لے کر یہ چھوٹا سا گھر خرید لیا تھا۔ شینا کو معمولی معمولی باتوں پر یاد آئی۔

دریندر کو کریم کلر پردے پسند تھے۔ لیکن ان کے لیے پیسے نہیں تھے۔ گھر چاہے دو کمروں کا تھا لیکن اس میں بیس فٹ اور تیس فٹ کا لان تھا۔ اس میں کلکتہ کی گھاس اور دو رنگوں والی .کن .یلیا کی بیلیں لگانا چاہتا تھا۔ اس کے ایک پہلو میں رات کی رانی اور ایک پہلو میں سورج مکھی، چنبہ اور چنبیلی کے پھول بھی۔

شینا نے ٹرنک میں پڑی سونے کی دو چوڑیاں بیچ کر کریم کلر کے پردے خریدے۔ دریندر کے پوچھنے پر شینا نے بتایا، مکان کی تعمیر میں ماں نے کچھ نہیں بھیجا تھا۔ اس لئے کسی آنے والے کے ہاتھوں پانچ سو روپے بھیجے ہیں۔ سچ سچ شینا دل کے اس مقام پر کھڑی تھی جہاں جھوٹ بھی سچ ایسا مقدس ہوتا ہے۔ پانچ ماہ پہلے بیڈ مشن کھیلتے ہوئے اچانک دریندری کی سانس اکھڑی اس کے بعد ہر روز شام کو عجیب سی تھکاوٹ محسوس کرنے لگا تھا۔ کوئی ٹھیس کوئی درد نہ تھا۔ لیکن یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہڈیوں میں سے کچھ پگھل رہا ہے------ اب تو گذشتہ ماہ سے دریندر نے دفتر سے چھٹی لے لی تھی۔

شینا نرسری سے ایک پودا روز خرید کر لاتی۔ ہر روز صبح اپنے چھوٹے سے

باغیچے کو دریندر کے ہاتھوں کی یوں لمس دیتی جیسے دریندر کا تل بھرا روز زمین میں بیج رہی ہو۔

شینا کا بہت دل چاہا۔ دریندر کا تل بھورا وہ اپنی کوکھ میں بھی بیاہ لے۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اب تو ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا تھا کہ کتنا اچھا ہوتا اگر دریندر نے شادی نہ کی ہوتی------- ایسے مریض کے لئے جسمانی تلخی موت کی ہچکی بھی ہو سکتی ہے۔ امید---------- یہ سب معلوم ہوتا------ شینا کی حسرت جاگی-- لیکن اب

کسی حسرت میں بھی کھونے کا وقت نہیں تھا۔ اب ہر لمحہ صرف دریندر کے چہرے کی طرف دیکھنے کا تھا۔ شینا جاگتے دریندر کو بھی تکتی رہتی اور سوئے دریندر کو بھی۔

شینا کے ہمسایہ میں ایک گھر کب سے خالی پڑا تھا۔ جس کی بے خانمائی سے کبھی کبھی شینا کو رات کے وقت ڈر لگتا تھا۔ وہ گھر ان دنوں اچانک آباد ہوگیا۔ ایک عورت ایک مرد اور دو بچے اس گھر کی آبادی تھے۔ شینا کو دیوار کے اس پار سے آتی آوازیں بھلی لگنے لگی۔ جن میں بچوں کی کلکاریں تھیں۔ ضد بھری چیخیں تھیں' مرد اور عورت کا ایک دوسرے کو پکارنا۔ لڑائی جھگڑا' دنگا فساد۔ شینا سستے گھر کی ان علاقوں کے متعلق سوچ کر بمشکل مسکرا دی۔ اسے معلوم تھا کہ اب بے خانمائی رینگتی رینگتی دیوار سے پھاند کر اس گھر میں پہنچ رہی ہے۔

جس لمحے شینا کے دروازے پر دستک ہوئی شام کا وقت تھا۔ شینا نے اپنے بھائی باپ پر بھی دل کی اس حالت کو چھپائے رکھا۔ اسے کسی کا اس کے متعلق پوچھنا پسند نہیں تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی۔ مرنے سے پہلے دریندر کو مردہ حالت میں کوئی دیکھے۔ اس لئے اس وقت کسی کا آنا غیر متوقع تھا۔ سوائے ڈاکٹر راؤ کے جو گزشتہ دنوں ایک بار دریندر کو کسی بہانے سے دیکھ گیا تھا۔ دوسری بار اس کا آنا' دریندر کے لئے شبہ پیدا کر سکتا تھا۔ اس لئے شینا کو دروازے پر دستک ناگوار گزری۔ اس نے محتاط ہاتھوں سے دروازہ کھولا دیکھا۔ آنے والا ڈاکٹر راؤ نہیں تھا۔ بلکہ برابر میں ابھی ابھی آباد ہوتے گھر کی عورت تھی۔ وہ عورت کچھ تذبذب میں تھی کہنے لگی۔ آپ کے گھر شاید فون ہے کیا میں فون کر سکتی ہوں۔ میں آپ کی نئی پڑوسن مسز کیور ہوں.....

شینا نے دریندر کے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے صرف اتنا کہا' وہ سو رہے ہیں۔ مسز کیور آپ فون کر لیں۔ لیکن ذرا آہستہ آواز میں تاکہ وہ جاگ نہ پڑیں.....

عام سا فون تھا۔ عورت نے اپنے خاوند کے آفس کا نمبر ڈائل کر کے پوچھا تھا کہ وہ دفتر میں ہیں یا باہر گئے ہوئے ہیں---- فون کرنے اور سننے کے بعد وہ

نڈھال سی ہوگئی۔ شینا نے اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے پانی پینے کے لئے پوچھا۔ گھر میں کوئی گھبرا دینے والی بات ہوگئی ہو اور وہ شاید اس کی کچھ مدد کر سکے۔

عورت کی عمر اگرچہ زیادہ نہ تھی۔ لیکن وہ مرجھائی سی دکھائی دے رہی تھی۔ ویسے ابھی تک اچھے ڈھب والی تھی وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔ کہنے لگی۔ یہ نہیں ویسے ہی دیر ہوگئی ہے۔ ابھی وہ گھر نہیں آئے۔ سوچا آفس سے معوم کرلوں ..... عورت کے سادہ سے لفظوں کی دراڑوں میں جو فکر چھن رہی تھی۔ وہ اس کی نہیں تھی۔ لیکن شینا نے اس سے زیادہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

عورت چلی گئی۔ رات گئے اس کے گھر سے مرد کے اونچا بولنے کی اور بعد میں عورت کے بلک بلک کر رونے اور پھر سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ تب شینا کو شام والا خیال سچ معلوم ہوا۔ عورت کی اداسی ایک دن کی نہیں تھی۔ اس کے پیچھے شاید بہت سارے دن تھے۔

دریندر کی کمزوری دن بدن بڑھتی چلی گئی۔ وہ تھوڑا سا اٹھتا یا باغیچے تک جاتا یا صرف غسل خانے کی حد تک تکلیف برداشت کرتا تو اس کے ماتھے پر اوس سی جم جاتی وہ نڈھال سا چارپائی پر کچھ اس انداز سے لیٹتا کہ اس کی ادھ کھلی.... آنکھوں سے یہ معلوم کرنا مشکل ہو جائے کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ شینا گھر میں سب کچھ دبے پاؤں کرتی کہ وہ کھڑکے سے جاگ نہ پڑیں۔

تیسری دوپہر---- شینا نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ مسز کپور بازار سے کچھ سبزی خرید کر گھر لوٹ رہی ہے اور پھر سبزی گھر میں چھوڑ کر شینا کے گھر کی طرف آتی دکھائی دی۔

شینا نے کھڑکے سے پہلے ہی دروازہ کھول دیا۔ مسز کپور نے جھجکتی ہوئی آواز سے فون کرنے کی اجازت چاہی---- پھر وہی نمبر---- وہی آفس---- اور وہی معلومات وہ فون بند کرکے بھری ہوئی آنکھوں سے بے سہارا سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اتفاق تھا کہ شینا نے اپنے لئے چائے بنا رکھی تھی۔ اس نے دو پیالوں میں

چائے انڈھیل کر ایک پیالی اس عورت کے آگے رکھ دی۔ مسز کیور نے رسماً" بھی انکار نہیں کیا۔ شاید اس وقت اسے ایک تلخ اور گرم گھونٹ کی اشد ضرورت تھی۔ صرف گرم گھونٹ کی بلکہ پرجوش اور ہمدردانہ لہجے کی بھی۔ وہ کہنے لگی شینا بھین میں آپ کو بے وقت تکلیف دیتی ہوں---- شینا کے ہمدرد اور معصوم چہرے کے روبرو اس نے دل کی بات کہہ ڈالی میرے خاموند کی زندگی میں معلوم نہیں کتنی عورتیں ہیں---- آج جب میں سبزی خریدنے بازار گئی تھی۔ دور سے ایک کار دکھائی دی یوں لگا جیسے وہ بیٹھے ہیں اور ان کے ساتھ ایک عورت--- یہ بھی سوچا شاید یہ میرے دل کا وہم ہو' وہ تو آفس میں بیٹھے ہوں گے۔ اس لئے میں نے فون کیا---- وہ سچ مچ آفس میں نہیں ہیں۔ تب تو مجھے یقین ہوگیا وہی تھے۔ اور ساتھ معلوم وہ کون تھی----" مسز کیور نے بتایا کہ جس علاقے میں وہ پہلے رہتے تھے۔ اس کے پڑوس میں ایک عورت تھی ان کے گھر آنا جانا شروع کر دیا۔ میں نے سوچا یہ گھر بدل لیں گے۔ تو یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا--- لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا وہ کون تھی---- کوئی نئی معلوم ہوتی تھی؟

مسز کیور نے بھیگی پلکوں سے کہا جب شام ہوتی ہے میرا خاوند گھر نہیں آتا سوچتی ہوں' معلوم نہیں وہ اس وقت کس کے پاس ہوگا۔ اس کا انتظار کرتے ہوئے بھی روتی ہوں اور جب وہ گھر آتے ہیں۔ تب انہیں دیکھ کر بھی روتی ہوں۔

شینا کے دل میں آئی۔ ایک اس کا خاوند ہے جو معلوم نہیں کس کس کے پاس جاتا ہے لیکن رات گئے گھر لوٹ آتا ہے اپنی بیوی کے پاس---- لیکن میرا خاوند جلد بہت جلد اس جگہ چلا جائے گا۔ جہاں سے وہ کبھی نہیں لوٹے گا۔ میرے پاس انتظار ایسا کچھ بھی نہیں رہے گا۔ شینا کے چہرے پر سیاہی پھیل گئی۔ مسز کیور نے بڑے درد سے پوچھا۔ شینا بھین آپ کے شوہر بیمار ہیں۔ میں بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں وہ آفس نہیں جاتے۔ کہیں بھی باہر نہیں جاتے----؟ شینا کا دل بھر آیا۔ دل کا چھید جو اس نے نہیں دکھایا تھا۔ مسز کیور نے دیکھ لیا تھا۔

مسز کیور نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اس کے دل میں رشک آمیز جذبات امڈ

آئے- یہ کتنی خوش قسمت عورت ہے! جس کا خاوند آخری سانس تک اس کا ہے- وہ مر کر بھی اس کے لئے زندہ رہے گی- اس کے لگائے ہوئے پودے جب پھول دیں گے- اسے ہر پتی سے ہر رنگ سے اس کی مہک آئے گی-

شینا بھیگی آنکھوں سے اٹھ کر جاتی مسز کپور کی طرف دیکھتی رہی---- مجھ سے تو اس کے نصیب اچھے ہیں جب اس کا خاوند آتا ہے تو یہ اس سے جھگڑتی ہے اس کے برابر ہو سکتی ہے- لیکن میں---- میں کس سے جھگڑوں گی- میں کس کے برابر ہوں گی؟

شینا کے کانوں میں اپنی اور دیریندر کی آواز بھر گئی- دیریندر گھر لوٹتے ہوئے شینا کے لئے پھول لاتے ہوئے کہتا تھا- میری اکلوتی بیوی دیکھ----: شینا اس کے کندھر پر سر ٹکا کر کہتی تھی- میرے اکلوتے خاوند---- اپنے ہاتھوں سے انہیں میرے بالوں میں سجا دے..... آج---- باغیچے سے نیا کھلا پھول توڑ کر دیریندر کے کمرے میں رکھتے ہوئے شینا کو محسوس ہوا- اس کے سینے میں پڑا ہوا چھید بہت بڑا ہو گیا ہے-

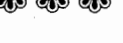

رام جی کے کنویں کی بو کی

یہ راستہ جندرو کے کھیتوں کی طرف جاتا ہے؟

ہماچل پردیش کے ایک ریسٹ ہاؤس میں ہمیں رات بسر کرنا تھی۔ لیکن کئی میل دور سے ہم راستہ بھول کر اس راہ پر نکل پڑے تھے۔ جو ریسٹ ہاؤس کی طرف نہیں جاتی تھی۔ شام کے ملگجے سائے پھیل چکے تھے۔ رات بسر کرنے کے لئے ہم نے ایک راہ گیر سے کسی مناسب ٹھکانے کا پوچھا تو اس نے پہاڑ کی دوسری طرف اشارہ کر کے بتایا کہ یہ راستہ جندرو کے کھیتوں کی طرف جاتا ہے۔

پہاڑوں کے درمیان بہتے دریا کے علاوہ وہ پل بھی نظر آ رہا تھا جو ہمیں پہاڑ کی اوٹ میں لے جاتا۔ ڈوبتے سورج کی سرخی میں ٹین کی چھت والا گھر یوں چمک رہا تھا۔ جیسے آڑو اور آلوچوں کے درختوں میں ایک بڑا سا جگنو چمکتا ہے۔ لیکن جندرو کے کھیت کسی تنہا عورت کی داستان کہتے محسوس ہوتے یقین نہیں آتا تھا کہ ان سینکڑوں درختوں میں ایک عورت تنہا بھی رہ سکتی ہے۔

گاڑی کو نشیبی پل کی راہ میں ڈالا اور پل کی دوسری جانب ٹین کی چھت والے گھر کے موڑ کو ڈھونڈا' تو آگے تمام راستہ ٹوٹا پھوٹا تھا۔ اس لئے گاڑی کو نیچے پل کی ایک طرف کھڑا کر کے باقی راستہ پیدل ہی طے کیا۔

میں اکیلی نہیں تھی۔ امروز میرے ساتھ تھا۔ اس لئے راستے کی دشواری کا خیال تک نہ آیا۔ رات بسر کرنے کے لئے جگہ کی تلاش کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ بس یہی خیال تھا کہ جندرو کو ضرور ملا جائے جو جنگل میں ایک جگنو کی طرح زندہ ہے۔

چڑھائی چڑھ کر ابھی دو ہی موڑ کاٹے ہوں گے کہ بھٹوں کا گٹھا کندھے پر رکھے پگڈنڈی کی طرف سے اترتی ہوئی ایک عورت دکھائیدی۔ اس نے دوپٹے کو سر پر پگڑی کی طرح باندھ رکھا تھا۔۔۔۔ اگر وہ چل نہ رہی ہوتی تو بھٹوں کے کھیت میں کھڑی کسی درخت کی شاخ کی طرح محسوس ہوتی۔ سوچا کہیں یہی جندرو نہ ہو۔ لیکن پھر نیچے اوپر جاتی پگڈنڈی کی طرف دیکھتے ہوئے ہم نے پوچھا "کیا جندرو کے کھیتوں کی طرف یہی راہ جاتی ہے؟

اس نے سر پر بندھے ڈوپٹے کو کھولا اور اسے پھیلا کر سر کو اچھی طرح ڈھانپتے ہوئے جواب دیا۔۔۔۔ میں اوپر کھیتوں سے تمہاری گاڑی کی آواز سن کر تمہیں دیکھنے آئی ہوں؟

اس کی پگڑی کا اب ایک سیدھا سادہ سا دوپٹہ بن گیا تو ایک لمحہ محسوس ہوا جسے ارد گرد کے پہاڑ ایک چھلاوہ تھے اور جندرو باجرے کے کھیت کے کنارے کھڑی کوئی میدانی عورت۔

"آپ شملہ سے آئے ہیں؟"

"نئی دہلی سے۔۔۔۔"

جب اسے بتایا کہ ہم راستہ بھول کر رات بسر کرنے کے لئے کسی جگہ کی تلاش میں ہیں تو وہ ہنس پڑی۔ اس نے اپنے گھر کی راہ بتائی اور کہا میرا بیٹا شملے پڑھتا۔ میں سمجھی اس نے بھیجا ہے پہلے بھی ایک بار اس کے اسکول کے ایک لڑکے کے والدین یہاں رہنے کے لئے آئے تھے۔

جندرو کا چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا۔ نیچے کوٹھریوں میں کھانے پینے کا سامان رکھا تھا۔ اور چوبی سیڑھی چڑھ کر اوپر کی کوٹھریاں اس کے رہنے کے لئے تھیں۔ نیچے کچھ فاصلے پر تین کوٹھریاں اور تھیں۔ جو کھیتوں میں کام کرنے والے مزارعوں کے لئے وقف تھیں باہر گائیں بندھی ہوئی تھیں۔۔۔۔ اور پاس ہی بھورے بالوں والا ایک کتا بیٹھا تھا۔

جندرو نے ایک چولہے پر بھیڑیاں ڈال کر چنے کی دال رکھ دی۔ دوسرے

چولہے پر چائے کا پانی۔

چوبی چھت پر ہمارے بیٹھنے کے لئے مونڈھے رکھ دیئے گئے۔ چائے کے دوران گفتگو چلتی رہی۔ کیا یہاں سردیوں میں برف باری ہوتی ہے یا نہیں۔ آڑو اور آلوچے کب پکتے ہیں؟ اناج بیچنے کے لئے کون سی منڈی قریب ہے۔ اور پھر ہماری یہ چھوٹی چھوٹی باتیں چولہوے پر ابالے کھاتی دال کی طرح گھل مل گئیں۔ جندرو نے بتایا۔ میرا جنم سدھواں کلاں میں ہوا۔ باپ دادا کی جاگیر اب بھی وہیں ہے کوئی بھائی نہیں تھا اس لئے شروع سے ہی کھیتوں میں کام کرنا پڑا۔ ابھی ہاتھ پاؤں چلانے کے قابل ہوئی تھی کہ اپنے باپ کی لٹھ بن گئی۔ بابا کو دائیں آنکھ سے کم دکھائی دیتا تھا۔ جہاں کہیں انہیں جانا ہوتا تھا ایک ہاتھ میں لاٹھی پکڑتے دوسرے سے میرا ہاتھ۔

بالکل دوسری لٹھ کی طرح تھی۔

میں انہیں دو کوس دو کنوؤں تک لے جاتی۔ اس علاقہ میں بہت سے مخیر اور خدا ترس لوگ آباد تھے۔ جو دو دو کوس پر مسافروں اور غریبوں کے لئے کنویں یا سرائیں بناتے تھے۔ میرے باپو کنویں میں سے مٹی ریت نکالنے کا کام کرتے تھے۔ میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ وہ کنویں میں سے مٹی نکالنے والوں سے چمڑے کی بوکیاں بنواتے تاکہ راستے میں مسافروں کو پیاس لگ جائے تو انہیں آسانی سے پانی مل جائے۔ میں نے جندرو کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ پھر تو آج ہم بھی مسافر ہیں اور اس علاقہ کی قدیم روایت مکمل کرنے یعنی تمہارے کنویں کا پانی پینے کے لئے آپہنچے ہیں۔

جندرو کا چہرہ سچ مچ بھرا بھرا سا تھا۔ پانی سے بھرے ہوئے بوکے کی طرح وہ ہنس پڑی کہنے لگی۔ باپو کو بوکیوں کا بڑا فکر رہتا تھا۔ گاؤں کے کنوارے مشٹنڈے کبھی مونجھ کی رسی کاٹ جاتے اوز کبھی بوکی کھول دیتے۔ بابا ہر روز کنوؤں کے پھیرے کاٹتے رہتے تھے۔ جب بابا زندہ نہ رہے تو یہ بوجھ مجھ پر اکیلا آن پڑا۔ بھائی جو کوئی نہ تھا کھیتوں میں کام اور سخت دھوپ میں دو دو کوس جا کر باپو کے کنویں کی

دیکھ بھال بھی کرتی۔ دور دور گاؤں میں ان کنوؤں کی دھوم تھی۔ اور یہ رام جی کے کنویں مشہور تھے۔

جندرو کی باتیں سنتے ہوئے میرا دل بھی کنویں کے پانی کی طرح چھلکنے لگا۔ میں نے ایک دم بے دھڑک ہو کر پوچھا۔ جندرو! تو بھی تو رام جی کے کنویں کی ایک بوکی ہے۔ تیرے دل کا اور تیری جوانی کا پانی بھی کسی نے پیا؟

جندرو کے چہرے پر ایک پل کے لئے لالٹین کی سیاہی کا دھواں لہرا گیا۔ اور پھر دوسرے ہی پل میں وہ لالٹین کی جوت کی طرح جلتی ہوئی کہنے لگی۔۔۔۔ بس وہ بھی جانو ایک راہ گیر تھا۔

میری تو سچ مچ زندگی کنویں کی بوکی کی طرح ہے۔ جب اس پیاسے نے اپنے ہاتھوں کی اوک کو میرے سامنے کیا تو میں تمام کی تمام اس کی اوک میں جا گری۔

جندرو نے جب خالی بوکی کی طرح ایک گہرا سانس لیا۔ تو جیسے اس کی آہ میرے منہ سے نکل گئی ہو۔ "نصیب جلی عورت" جب کنویں کی بوکی ہوتی ہے تو ایک مسافر کی پیاس سے خالی ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی لج دوبارہ اس کے کنویں کو کسی کے پانی سے نہیں بھرتی۔

جندرو نے بھری بھری اور خالی خالی آنکھوں سے ارد گرد کے پہاڑوں کی طرف دیکھا جلد ہی اس کی نظریں پتھروں سے ٹکرا کر لوٹ آئیں۔ وہ کہنے لگی۔ "نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ کوئی غم نہیں' میرا پانی تو کام آیا' اس کی پیاس تو بجھ گئی۔ مجھے کوئی افسوس نہیں۔ نہ اس پر نہ اپنے آپ پر۔

جندرو بیتے دنوں کی جھیل میں ڈوبتی ہوئی کہنے لگی' لڑکپن میں ایک گیت بڑا اچھا لگتا تھا۔ جو خود ہی بیٹھ کر گاتی اور خود ہی روتی تھی۔

امباں تے توتاں دی ٹھنڈی چھاں جی
کوئی پردیسی جوگی آ لتھا
ایس بالے جوگی دے لے لے کیس جی
دمیاں کٹورے جوگی نہاوندا

ایس بالے جوگی دے تکھے تکھے نین جی
سرمہ سلائی جوگی پاوندا

آموں اور شہتوت کے پیڑوں کی ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ یہاں ایک پردیسی جوگی نے پڑاؤ ڈالا ہے اس نوخیز جوگی کے لمبے لمبے بال ہیں کیونکہ وہ دہی کے کٹورے بھر بھر کر نہاتا ہے۔ اس نوخیز جوگی کے نین تیکھے اور گھائل کرنے والے ہیں کیونکہ وہ آنکھوں میں کاجل لگاتا ہے۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ بچپن میں جو گیت گائے تھے میری تقدیر بنیں گے بس اس کا بھی وہی روپ تھا۔ وہ بالکل جوگیوں کی طرح گاؤں میں آیا تھا کندھے پر کیمرہ لٹکائے ہوئے اس کے تھیلے میں رنگ اور برش تھے۔ وہ گاؤں کی تصویریں بنانے کے لئے آیا تھا۔ اور نمبردار کے ہاں ٹھہرا تھا۔

"---- اور ہماری جندرو اس کی تصویر پر مرمٹی۔" جب میں نے کہا تو مجھے محسوس ہوا جندر کو "ہماری جندرو" کہتے ہوئے معلوم نہیں ایک لمحہ میں اس کے ساتھ کیا بیت گیا۔

نہیں۔ میں نے تصویریں بعد میں دیکھیں۔ پہلے اس نے میری آواز سنی تھی۔ گاؤں میں شادی تھی اور وہاں ہجولیوں کے ساتھ میں گیت گا رہی تھی۔

امباں تے توتاں دی ٹھنڈی چھاؤں جی

وہ یہ گیت سنتا رہا۔ دوسری رات شادی پر مدعو عورتیں "جاگو" لے کر نکلیں "جاگو" گاتی عورتوں میں میری آواز سب سے نمایاں تھی۔ "جاگو" جانتے ہو کیا ہوتا ہے۔

پیتل کی گاگر کے ارد گرد آٹے کی موٹی تہہ بنا کر اس میں انگوٹھے کو دبا کر دیئے ایسے گڑے بنائے جاتے ہیں۔ ان چار گڑوں کے دیئے بنا کر تیل ڈال کر انہیں جلایا جاتا ہے اور پھر لڑکی کی ممانی دائیوں والی گاگر اٹھا کر گھر گھر جاتی ہے اور تیل مانگتی ہے اس کے ساتھ ساتھ لڑکیاں گیت گاتی ہوئی چلتی ہیں۔

جاگو آئی

بگو جگاؤ

وے جاگو آئی آ----

جن گھروں کے لوگ کنجوس ہوتے ہیں اور جاگو میں تیل نہیں ڈالتے ان کو لڑکیاں گالیاں دیتی ہیں۔ جب میں جاگو گاتی نمبردار کے گھر پہنچی تو وہ تصویریں بنانے والا میری طرف دیکھتا رہا اور میں----

آگے جندرو نے جو کچھ کہنا تھا۔ کہتے ہوئے اپنی زبان کاٹ لی۔ میں نے کہا----

جندرو بھی ایک دیئے کی طرح جل اٹھی۔

ایک لمحے کے لئے محسوس ہوا جیسے جندرو کی آنکھیں بجھ گئیں تھیں شاید اسے تیل کے ختم ہونے کا اندیشہ یاد آیا ہو۔ لیکن دوسرے لمحے اپنے دیئے میں اپنا ہی تیل ڈالتے ہوئے کہنے لگی۔ جب اس نے گھر بسایا تو سچ مچ میں گھر میں دیئے کی طرح جل اٹھی تھی۔

----پھر؟"

میں زیتون کی کاشت کراتی تھی اور وہ تصویریں بناتا تھا۔ کبھی رنگوں سے اور کبھی کیمرے سے۔

سر پر میرے باپ کا سایہ تھا۔ اگرچہ وہ نحیف اور کمزور سا۔ اس سائے کے اٹھ جانے کے بعد جیسے ساری زمین بنجر ہو گئی۔ انہیں دنوں میرے ہاں لڑکا پیدا ہوا۔ میرے بیٹے کا باپ کہنے لگا۔ میرا گاؤں میں جی نہیں لگتا۔ اسے ان پہاڑوں سے بہت لگاؤ تھا۔ اس لئے ہم گاؤں کی زمین چھوڑ کر یہاں آباد ہوئے۔ ایک بات کبھی کبھی بہت یاد آتی ہے اپنا گاؤں چھوڑنے لگی تو کہورا جو ہمارا پرانا مصلی تھا آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگا۔ ضلع کی مالکن۔ یہ سب چھوڑ چھاڑ کر کہاں چلی ہو؟ ہمارے ہاں چاہے کسی کے دس بیگھے زمین ہو۔ مصلی اور مزارعے اسے ضلع کی مالکن ہی کہتا ہے۔ میں کچھ نہ بولی اس زمین سے ہم روٹھ گئے اور یہ زمین ہم سے روٹھ گئی۔ یہ سب آڑو اور آلوچوں کے درخت میرے ہاتھوں سے لگائے ہوئے

ہیں- یہاں آ کر اس نے پہاڑوں اور وادیوں کی بڑی بڑی خوبصورت تصویریں بنائیں-

میں نے گھر کی خالی دیواروں کی طرف دیکھا- جہاں سبز اور سرخ مرچوں کے کچھ ہار خشک ہونے کے لئے لٹکائے ہوئے تھے---- پوچھا---- وہ تصویریں کہاں ہیں؟

اس کی سب سے حسین تصویر اس کا بیٹا میرے پاس تھا- اور باقی سب چھ وہ اپنے ساتھ لے گیا-

"کہاں؟"

جہاں وہ خود چلا گیا- یہاں جب پہاڑوں کی تصویریں خریدنے کے لئے ایک جرمن لڑکی آئی تو وہ بھی اس کے ساتھ بک گیا- معلوم نہیں کہاں چلا گیا جرمن یا پھر کہیں اور-

میں نے جندرو کی طرف دیکھا- وہ پتھر کی مورت کی طرح بے حس تھی- محسوس ہوا وہ آیا تو رنگوں سبھری ہوئی تصویریں بنانے کے لئے تھا- لیکن ایک تپھر کی مورت بنا کر اس میں رنگ بھرے بغیر چلا گیا ہے---- پوچھا "کبھی اس کی کوئی چٹھی یا خط----؟"

انکار میں جواب دیتے ہوئے جندرو کی خاموشی پہاڑوں کی کھائی کی طرح گہری ہو گئی- ایک آواز جو شاید پہلے بھی موجود تھی- ایک بہتے ہوئے پہاڑی چشمے کی لیکن کہیں دور بہت دور اب بالکل ہمارے کانوں کے قریب پہنچ گئی تھی- بڑی روح پرور اور ایک توانائی سے مچلتی ہوئی-

ایک دم جندرو ہنس پڑی- اور اٹھ کر کھانے کی تیاری کرتے ہوئے کہنے لگی- وہ بھی سچا تھا- یہاں جنگلوں میں اس کی تصویروں کو کون دیکھنے والا تھا- وہاں تو دینا دیکھتی ہو گی---- اس لمحے جندرو کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے محسوس ہوا---- یہ جندرو کبھی رام جی کے کنویں کی بوکی تھی- اب پرسکون ٹھنڈے پانیوں کا ایک چشمہ بن چکی ہے-

ایک لڑکی ایک جام

مشہور مصور سمش نندا کی یہ کہانی دراصل میں نے پچھلے برس لکھی تھی۔ دلی میں ان کی تصویروں کی نمائش ہو رہی تھی۔ ہفتہ بھر لگاتار کسی نہ کسی اخبار میں ان کے فن پر تبصرہ شائع ہوتا تھا۔ بڑے بڑے دانشور یہ تعریفی تنقید لکھتے تھے۔ مجھے فن مصوری سے متعلق اتنی واقفیت تھی جتنی کہ فن سے بے بہرہ مگر حساس شخص سے تعریف کی ہوتی ہے۔

نمائش میں رکھی گئی تصویروں کی خاموشی سے تعریف کرتے ہوئے میری آنکھیں سمیش نندا کی دو تصویروں پر جم کر رہ گئیں۔ ایک تصویر کے نیچے لکھا تھا۔۔۔۔۔ "ڈھائی پتیاں' ڈیڑھ پتی۔۔۔۔" اور دوسری تصویر کے نیچے لکھا تھا۔۔۔۔۔۔

"ایک لڑکی' ایک جام۔"

پہلی تصویر چائے کے باغ میں چائے کی پتیاں چنتی ہوئی دو پہاڑی دوشیزاؤں کی تھی اور اس تصویر کا مفہوم مصور نے کچھ یوں سمجھایا تھا۔ "چائے کے پودے کی آخری کونپل صرف ڈیڑھ پتی ہوتی ہے۔ ایک پوری پتی اور اس سے جڑی ہوئی ایک ننھی سی پتی۔ اس ڈیڑھ پتی کو آب و تاب ذرا مختلف ہی ہوتی ہے۔ اس آخری کونپل کے نیچے ڈھائی پتیاں اگتی ہیں۔ نہایت نرم اور پھر ڈیڑھ پتی توڑ کر الگ رکھ لیتے ہیں۔ اس پتیوں سے جو چائے بنتی ہے وہ بہت مہنگی ہوتی ہے۔ ہم لوگ جو چائے پیتے ہیں وہ موٹی پتیوں کی ہوتی ہے۔ ایک ثابت و سالم پودے سے چائے کی صرف چار ننھی پتیاں اترتی ہیں۔ سارے باغ سے آخر کتنی پتیاں حاصل کی جاسکتی

ہیں؟ چائے ساٹھ روپے پونڈ سے بھی مہنگی ملتی ہے۔

ہمیش نندا کی تصویر میں ادھر جو پہاڑی دوشیزہ تھی اس کا چہرہ نصف سے بھی کم دکھائی دیتا تھا۔ دیکھنے والے کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ لیکن پھر بھی اس کے حسن کا جو انداز نظر آتا تھا' اس سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تمام پہاڑی دوشیزائیں چائے کا ایک پودا ہوں..... بکھرا اور پھیلا ہوا پودا۔ اور اس طرف کھڑی ہوئی وہ لڑکی جیسے پودے کی آخری کونپل تھی..... مگر میں نے اپنی رائے اپنے دل ہی میں محفوظ رکھی اور مصور سے کچھ نہ کہا۔

دوسری تصویر جس کے نیچے "ایک لڑکی' ایک جام" لکھا تھا' پہاڑی دوشیزہ کے انوکھے حسن کی حامل تھی۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں "منہ بولتی تصویر" سچ مچ میں نے ایسی منہ بولتی تصویر پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے بارے میں مصور نے کوئی وضاحت پیش کی نہیں تھی۔ میں نے یہی کہا "ایسا جام پینے کے لئے ایک عمر بھی کم ہے۔"

مصور نے ٹھٹھک کر میری طرف دیکھا۔ مصور کی عمر ساٹھ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ نہ جانے شباب کا کونسا عالم ابھر کر اس کی آنکھوں میں آگیا تھا۔۔۔۔۔ وہ بولا۔۔۔۔۔ "اس تصویر کی آج تک ایسی ترجمانی کسی اور نہیں کی۔ یہ دراصل وہی بات ہے جسے میں کہنا چاہتا تھا..... اور تو اور میرے احباب نے بھی اس تصویر کے یہ معنی نہیں نکالے۔ کچھ لوگ مجھ سے مذاق کر رہے ہیں۔۔۔۔۔ "ایک لڑکی' ایک جام۔" جام تو ہر روز نیا میسر آسکتا ہے۔"

نہ جانے اس تصویر میں کون سی کشش تھی کہ نمائش ہفتہ بھر رہی اور میں نمائش تین بار دیکھنے گئی۔۔۔۔۔ دراصل وہ نمائش ہی "ایک لڑکی' ایک جام" تھی۔

وہ کوئی فنی اور شعوری بات نہیں تھی۔ میں نے اپنے دل سے اٹھی ہوئی ایک سادہ سی بات ہمیش نندا کی تخلیق سے متعلق کہہ دی تھی۔ یہ سادہ سی بات مصور کا دل ٹٹول کر اس کے ہونٹوں پر لے آئی۔

"میں کانگڑہ کے فن مصوری کی تحقیق کے لئے ایک گاؤں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پالم پور کے چائے کے باغات کچھ زیادہ دور نہیں تھے۔ یہ تصویر "ڈھائی پتیاں ڈیڑھ پتی" میں نے وہیں بنائی تھی۔ یہ لڑکی جو اس طرف کھڑی ہے' دراصل وہی لڑکی ہے جسے میں نے دوسری تصویر "ایک لڑکی' ایک جام" میں دکھایا ہے۔"

"یہ بات تو میں نے آپ کے بتانے سے پہلے نہیں پہچانی تھی۔ لیکن پہلے ہی دن ہی تصویر دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے تمام لڑکیاں چائے کا پودا ہوں۔ اور یہ لڑکی اس پودے کی بالائی کونپل ہو۔ سبز' ننھی' اور چمکتی ہوئی۔"

کمیش نندا کی بوڑھی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور انہوں نے کہا۔۔۔۔۔ "اب تو مجھے اور بھی یقین ہوگیا ہے۔ تم نے تو مجھ سے میرے دل کی بات کہلوالی ہے تم نے جس انداز میں میری دونوں تصویروں کا مطلب بیان کیا ہے اس سے میری کہانی سننے کا تمہیں حق حاصل ہوگیا ہے۔ اس سے پہلے میری کہانی کوئی نہیں سن سکا۔"

"میں نے اس لڑکی کو "ٹونی" کے نام سے پکارا تھا۔ میں نے اس کا اصل نام پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اس نے چائے کی پتیاں چنتے ہوئے "ڈھائی پتیاں اور ڈیڑھ پتی" والی بات مجھے سنائی تھی اور میں اس سے کہا تھا کہ تو بھی تو ان دوشیزاؤں کے پودے کی بالائی کونپل ہے۔۔۔۔۔ بہت مہنگی۔۔۔۔۔ خبر نہیں یہ چائے کون پئے گا؟"

"برسات کے دن تھے۔ ایک نالے میں باڑھ آگئی اور آس پاس کے دیہات کو آپس میں ملانے والی سڑک زیر آب ہوگئی۔ تین روز کے بعد اس سڑک زیر آب ہوگئی۔ تین روز کے بعد اس سڑک کا بدن دکھائی دیا۔ ادھر سے میں جا رہا تھا' اور ادھر سے ٹونی آرہی تھی۔ میں نے کہا۔۔۔۔۔ "آخری بارش تھم ہی گئی ایک بار تو یوں محسوس ہوا تھا جیسے یہ طغیانی رکے گی نہیں۔

کچھ خبر ہے کہ ٹونی نے کیا کہا۔۔۔۔۔ "بابو! یہ بھی کوئی انسان کے آنسو ہیں جو کبھی خشک نہیں ہوتے۔"

میں ٹونی کے منہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کی صورت بے حد حسین تھی۔ وہ ایسی بات بھی کہہ سکتی ہے' میں یہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ایسی بات میں نے بنگالی ناول میں پڑھی تھی۔ مگر ٹونی تو کبھی بنگالی ناول نہیں پڑھا تھا۔ شاید سارے دیشوں کے دکھ کی ایک ہی زبان ہوئی ہے۔

میں اس کے گھر بھی گھر گیا۔ اس کا باپ تھا' ماں تھی' بہن تھی۔ دو بھائی تھے۔ ایک بھابی تھی۔ میں نے اس کے سارے گھر کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ یہ بات نہ جانے اس کے دل کے کس گوشے سے ابھری تھی۔ میں نے اس کے دکھ کے بیج ڈھونڈ لئے۔ اس کے باپ کے سر پر قرضہ کا بھاری بوجھ تھا۔ وہاں لڑکیوں کی قیمت پڑتی تھی۔ تین چار سو روپے سے ایک ہزار روپے تک۔ اور ایک قرض خواہ نے پندرہ سو روپے کے بدلے میں اسے مانگ لیا تھا۔ ٹونی کہتی تھی۔۔۔۔۔ "وہ انسان نہیں دیو ہے۔ مجھے خواب میں بھی کہتی تھی۔۔۔۔ "وہ انسان نہیں دیو ہے۔ مجھے خواب میں بھی اس سے خوف آتا ہے۔"

ایک دن میں نے ٹونی سے تنہائی میں پوچھا "اگر میں میں تیرے خوف کے بندھن کاٹ دوں تو؟"

"وہ کیسے بابو؟"

"میں پندرہ سو روپے دیے دیتا ہوں۔ تم اپنے باپ سے کہہ کر رہ منگنی توڑ دو۔"

اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو میرے پاؤں پکڑ لیتی۔ مگر ٹونی نے سیدھا میرے دل پر ہاتھ ڈال دیا اور کہنے لگی۔۔۔۔۔

"بابو کیا تم مجھ سے شادی کرو گے؟"

کبھی میں نے کہا تھا۔۔۔۔۔ "ٹونی تو چائے کے پودے کی بالائی کونپل یعنی سب سے بیش بہا کونپل ہے۔۔۔۔۔ بہت ہی مہنگی۔۔۔۔۔۔۔ خبر نہیں یہ چائے کون پیے گا؟" اور آج ٹونی نے اپنی ہٹ دھرمی سے اس پتی کی چائے تیار کر دی تھی۔ میں نے یہ بات نہ سوچی تھی نہ کہی تھی۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا کہ میرا یہ

مطلب نہیں تھا۔ لیکن اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اس نے کہا۔۔۔۔۔
"بابو! کیا میں بھکارن ہوں؟"

میری اپنی زندگی بھی کچھ نہیں تھی۔ کتنی ہی لڑکیاں میری زندگی میں آئی تھیں اور چلی گئی تھیں میں صرف تھوڑی دور تک ہی ان کے ساتھ چل تھی۔ اور اب میرا اعتماد ہی اُٹھ چکا تھا۔ کہ میں زندگی بھر کسی کا ہم سفر ہو سکوں گا۔

"میری زندگی بہت گرم ہے ٹونی تو اسے نہیں پی سکے گی۔ تیرے ہونٹ جھلس جائینگے۔" اور میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔

"میں پھونک پھونک کر اسے پی جاؤں گی بابو۔"

"میں نے اس کی بات سنی۔ اس گھڑی اس کے چہرے کا جو انداز تھا اس سے مجھے محسوس ہوا کہ یہی وہ ٹونی ہے جس کے ساتھ میں زندگی کی طویل مسافت طے کر سکتا ہوں۔"

اپنے فیصلہ کو میں نے چاندی کے سکے کی طرح ٹنکا کر دیکھا۔ میں نے کہا۔
"تمہیں شاید معلوم نہیں میری زندگی میں کتنی ہی لڑکیاں آچکی ہیں۔ ہر ایک لڑکی کو میں نے شراب کے جام کی طرح پیا اور اپنا جام شراب سے دوبارہ لبریز کرلیا۔"

وہ ہنس پڑی اور بولی۔۔۔۔۔ "کیوں بابو! کیا تمہاری پیاس نہیں بجھتی؟"

میں نے اس سے کچھ نہ کہا اور وہ بولی۔۔۔۔۔ "بہت اچھا بابو۔۔۔۔۔
ایک بار جام بھرلو اور جب تک میرے دل کا یہ جام ختم نہ ہوجائے تب تک کسی اور جام سے اپنے ہونٹ نہ لگانا۔"

مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں نے اب تک جتنے جام پئے تھے وہ اجسام کے جام تھے دل جام نہیں تھے۔ اگر کوئی ایسا جام ہوتا تو تھا پھر جب تک اس کی شراب ختم نہ ہو جاتی تب تک میں کسی دوسرے جام سے منہ نہ لگا سکتا۔ شاید دل کے جام کی شراب کبھی ختم نہ ہوتی۔

میں نے اپنے فیصلہ کا روپیہ ٹنکا کر دیکھا لیا تھا۔۔۔۔۔ ٹونی کا فیصلہ تو درست

تھا ہی' ٹونی کے ماں باپ نے ہم دونوں کا فیصلہ تسلیم کرلیا۔ اور میں روپوں کا انتظام کرنے کے لئے شہر واپس آگیا۔"

سمیش نندا نے جب اپنی کہانی کا آغاز کیا تھا تو اس وقت آٹھ بجنے والے تھے آٹھ بجے نمائش کا وقت ختم ہو جاتا تھا۔ اس لئے تصویریں دیکھنے والے لوٹ گئے تھے۔ کسی نئے شخص کو وہاں آنا نہیں تھے۔ کہانی انجام کو نہیں پہنچی تھی۔ مگر کہانی کو یہاں تک لاکر مصور نے اسے وہیں روک دیا تھا۔۔۔۔۔ میں مصور کی طرف دیکھتی رہی۔۔۔۔۔ رکی ہوئی اس کہانی کے بارے میں سوچتی رہی۔ مصور جیسے بیخودی کے عالم میں کھو گیا تھا۔

چپڑاسی نمائش گاہ کا دروازہ بند کرنے کے لئے دہلیز میں آکھڑا ہوا تھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش رہنے کی تنبیہہ کی اور انتظار کرتی رہی کہ شاید رکی ہوئی کہانی آگے چل پڑے۔

مصور کی بند آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے اشکوں کی روانی نے کہانی کو بھی آگے بڑھا دیا۔۔۔۔۔ "میں جب روپے لے کر واپس گیا تو قسمت میرا جام میرے ہاتھوں سے چھین چکی تھی۔"

"کیا باپ نے ٹونی کا در پردہ بیاہ کر دیا تھا؟" میں نے کانپتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! اس سے زیادہ بھیانک حادثہ ہوا۔۔۔۔۔ ٹونی جس شخص کو دیو کہا کرتی تھی اس ساہوکار نے اپنا سودا ٹوٹنے کی خبر سن لی تھی اور اس نے دھوکے سے کسی کے ہاتھوں ٹونی کو زہر پلوا دیا تھا۔

"ٹونی کی چتا میں ابھی کچھ آنچ باقی تھی۔۔۔۔۔ تھوڑی سی آگ۔ میں نے اس آگ کو گواہ بنایا اور چتا کے گرد گھوم کر جیسے پھیرے لے لئے....."

مصور نے شاید تیس پینتیس برس کی عمر میں وہ پھیرے لئے ہوں گے۔ اگلے تیس برس تک نہ جانے کیسے اس نے ان پھیروں کی لاج رکھی ہوگی۔ یہ بات اس کے ساٹھویں برس سے بھی صاف ظاہر ہو رہی تھی پوچھنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ بیسویں صدی اسے سلام کر رہی ہو۔ آہستہ آہستہ

مصور کے ہونٹ پھڑکے۔

"ٹونی کہا تھا۔ ایک اقرار کرو بابو۔ جتنی دیر تک میرے دل کا جام ختم نہ ہو اتنی دیر تک کسی اور جام سے اپنے ہونٹ نہ لگانا..... اور وہ سامنے کھڑی ہوئی لڑکی گواہ ہے کہ میں نے کسی اور جام سے ہونٹ نہیں لگائے۔"

سامنے ٹونی کی تصویر تھی----- ٹونی------" ایک لڑکی' ایک جام۔"

موت نے مصور کے ہاتھوں سے وہ جام چھین لیا لیکن کوئی موت اس کے تصور سے وہ جام نہ چھین سکی۔ اور مصور کی ساری عمر اسے پیتے گزر گئی۔ اس صراحی کی شراب ختم نہ ہوئی۔

لگ بھگ ایک برس ہوچکا ہے۔ میں سمیش نندا کی زبان سے یہ کہانی سنی تھی۔ اور پھر اگلے ہفتہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ لیکن انہوں نے مجھے اسے چھاپنے کی اجازت نہیں دی۔ اس وقت میں نے کہانی میں ان کا نام بدل کر لکھا تھا۔ مگر انہوں نے کہا تھا کہ جب تک میری عمر کا آخری دن نہیں آتا تب تک میرا اس پر کوئی حق نہیں۔ اس جام کو پیتے ہوئے مجھے آخری سانس لینے دو۔ پھر اس کہانی کو شائع کرنا۔ ابھی نہیں۔ اس وقت میرا نام بھی بدل کرنا لکھنا۔

پچھلے ہفتہ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا-----

"مشہور مصور سمیش نندا وفات پاگئے۔" مصور کے فن سے متعلق اخباروں نے یہ بھی لکھا تھا------ "جس کمرے میں مصور نے آخری سانس لیا' اس کمرے میں صرف ایک ہی تصویر ٹنگی ہوئی تھی-----" "ایک لڑکی' ایک جام۔"

عمر چھوٹی تھی----- جام بڑا تھا----- آج مصور کا وہ دعوی درست ثابت ہوا۔ میں نے اس کہانی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ صرف ان کا اصل نام لکھا ہے ان کے کہنے کے مطابق۔

لال مرچ

"ڈاکٹروں کے انجکشن کو چھوڑو یار، جس گھر کے کتے نے کاٹا ہے اس گھر کی لال مرچیں اپنے زخم پر لگالو۔" ایک دوست نے کہا۔

"جس گھر کے کتے نے کاٹا ہے، اگر اس گھر کی کوئی خوبصورت لڑکی تمہارے زخم پر پٹی باندھ دے..... لڑکیاں بھی تو لال مرچ ہوتی ہیں۔" دوسرے دوست نے کہا۔

کالج کے تمام دوست لڑکے ہنس پڑے۔

اور وہ جیسے کتے نے کاٹا تھا ہنس کر کہنے لگا۔ "یار نسخہ تو اچھا ہے، مگر یہ تمہارا آزمودہ ہے نا؟"

گوپال نے عمر کی اٹھارہویں سیڑھی پر پاؤں رکھا ہوا تھا، اور گوپال کو محسوس ہوا کہ سیڑھی پر جوانی کے احساس کا ایک کتا دبک کر بیٹھا ہوا تھا، اور آج اس نے اچانک پاگلوں کی طرح اٹھ کر اس کی ٹانگ میں سے گوشت نوچ لیا تھا۔ اس روز سے گوپال کا دل اپنے زخم پر لگانے کے لئے ایک لال مرچ جیسی لڑکی تلاش کرنے میں لگ گیا تھا۔

لڑکیاں تو گوپال کے کالج میں بھی تھیں، پڑوس کے گھروں میں بھی، اس شہر کی گلیوں میں بھی، اور دوسرے تمام شہروں میں بھی۔ "مگر جس لڑکی میں تلاش کر رہا ہوں وہ کون ہے؟" گوپال اکثر یہ سوچتا۔

اور پھر گوپال لڑکیوں کو ایسے دیکھتا جیسے تھالی میں دال کو چنا جاتا ہے۔ چھوٹے قد کی موٹی، چپٹی ناک والی، لمبی، گول مٹول، اور جب ایسی لڑکیوں کو وہ دال میں

کنکروں کی طرح چن لیتا تو اسے تمام پرانی تشبیہیں یاد آجاتیں۔ لچکتی ہوئی ٹہنی جیسی لڑکی۔ چندن جیسی لڑکی دیو دار کے پیڑ جیسی لڑکی چاند کی پھانک جیسی لڑکی..... اور پھر گوپال سوچتا "کوئی بھی نہیں۔ ان میں سے کوئی بھی نہیں مجھے تو صرف لال مرچ جیسی لڑکی چاہئے۔"

ویسے تو کالج کے تمام لڑکوں میں کتابوں اور کورس کے بجائے لڑکیوں کی باتیں لمبی ہوگئی تھیں۔ مگر گوپال کی ہر بات کو جیسے "لڑکی" لفظ کے دروازے میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ کبھی ریڈیو پر نورجہاں کی آواز آتی "تیرے مکھڑے تے کالا کالا تل وے------ اومنڈیا سیال کوٹیاں" تو گوپال اپنے لال ہونٹوں پر ایک موٹے کالے تل کو انگلی سے ٹٹولنے لگتا اور پھر جیسے نورجہاں سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "ظالم ہر بار تو کہتی ہے سیال کوٹ کے لڑکے، کبھی اس جگہ لائل پور کے لڑکے تو کہا کر۔" نور جہاں نے تو گوپال کی بات کبھی نہیں سنی۔ مگر کالج کے لڑکوں نے ضرور گانا شروع کردیا۔ "او منڈیا لائل پوریا۔"

بھنے ہوئے چنے بیچنے والا کہتا "بمبئی کا بابو میرا چنا لے گیا" تو گوپال ہنستا۔ "چنا لے گیا تو ایسے کہتا ہے جیسے اس کی لڑکی بھگا کرلے گیا ہے۔"

عینکوں والی لڑکیاں گوپال کو لڑکیاں نہیں لگتی تھیں۔ "جب بھی آنکھوں کو دیکھنا ہو پہلے شیشے کی دیوار پار کرنی پڑتی ہے۔" گوپال کہتا اور ان لڑکیوں کو لڑکیوں کی فہرست میں سے ہی نکال دیتا۔

کسی لڑکی نے اونچی ساڑھی باندھی ہوئی ہوتی، پاؤں میں موزے پہنے ہوئے ہوتے، ہاتھ میں چھتری پکڑی ہوتی تو گوپال ہنس کر منہ پھیر لیتا "یہ لڑکی تھوڑی ہے۔ یہ تو ماسٹرنی جو طالب علم حساب میں کمزور ہو وہ ماسٹرنی سے شادی کرلے۔"

کوئی لڑکی گہرے رنگوں کے کپڑے پہنے ہوئی یا بانہوں میں چوڑیاں ہی بہت زیادہ ہوتیں تو گوپال کہتا "یہ تو رنگوں کا اشتہار ہے۔ لڑکی تو دکھائی دیتی نہیں، بس پوری کی پوری چوڑیوں کی دوکان ہے۔"

کسی کی بارات جارہی ہوتی تو اسے دیکھ کر گوپال اداس ہو جاتا چچ..... چچ.....

چچ۔ بچارے کا دیوالہ نکل گیا۔" گوپال کہتا۔ جب آدمی عاشق بننے سے پہلے شوہر بن جاتا ہے تو سمجھو اب بے چارے کے پاس صبر کی پونجی بالکل ختم ہوگئی۔ اور اس نے گھبرا کر دیوالیہ ہونے کی درخواست دے دی ہے۔"

"شاید وہ اپنی محبوبہ سے ہی شادی کرنے جا رہا ہو۔ گوپال کا کوئی دوست کہتا۔

اور گوپال سالہا سال اس زلف کی باتیں کرتا رہا جس کے سر کرنے میں اسے عمر گزرانی تھی۔

اور گوپال تشبیہوں میں کھو گیا۔ کالی رات جیسے بادل، مگر اسے کسی رات نے نیند نہیں دی۔ گھنے جنگل جیسے بال مگر وہ کسی جنگل میں کھو نہ سکا۔ سمندر کی لہروں جیسے بال، مگر وہ کسی لہر میں غوطہ نہیں لگا سکا۔ اور گوپال کی عمر کے جو سال ایک زلف کر سر کرنے میں لگانے تھے۔ وہ زلف کو تلاش کرنے میں ہی کھوتے رہے..... اور پھر گوپال اپنے سالوں کے کھو جانے سے گھبرا گیا۔

"تم بھی اب ہماری طرح دیوالیہ پن کی درخواست دے دو یار۔" کالج کے پرانے دوستوں میں سے جب کوئی ملتا تو گوپال سے مذاق کرتا۔

عمر کے اٹھارویں سال میں جوانی کے پاگل کتے نے گوپال کی ٹانگ کو کاٹا تھا اور زخم پر لگانے کے لئے گوپال ایک لال مرچ جیسی لڑکی تلاش کر رہا تھا، مگر اب عمر کے تیئسوں سال میں اس زخم کا زہر اس کے تمام جسم میں پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔

اب گوپال سوچنے لگا تھا۔ وہ نہ غالب ہے نہ لور کا وہ صرف گوپال ہے یا ایک ایشور داس یا ایک شیر سنگھ یا ایک اللہ رکھا۔ اور اس نے سرنگوں ہو کر دیوالیہ ہونے کی درخواست دے دی۔

"کیوں یار۔ آج ڈرم لڑکی کے گھر بارات جائے گی یا خانہ بدوش کے گھر میں؟"

"سناؤ بھابی کیسی ہے؟"

"اور کچھ نہیں تو ہم تمہاری لال مرچ کے دیور تو بن جائینگے۔"

"بیشک سونے کی انگوٹھی کی بجائے ہیرے کی انگوٹھی ہی دینی پڑے بھابی کا

گھونگھٹ ضرور اٹھائیں گے۔"

گوپال اپنے دوستوں کے مذاق کو اپنے ہاتھ پر شادی کے لال ڈورے کی طرح باندھے جا رہا تھا اور ہنستا ہوا کہتا جاتا تھا "ماسٹرنی ہے ماسٹرنی۔ عینک بھی لگتی ہے تمہاری بھابی۔

ماں نے جب رشتہ طے کیا تھا تو گوپال سے کہا تھا کہ اگر وہ چاہے تو کسی بہانے وہ لڑکی کو دکھا دے گی۔ مگر گوپال نے خود ہی انکار کر دیا تھا۔

"جب دیوالیہ ہی ہونے کی عرضی دینی ہے تو....."

ڈولی دروازہ پر آ گئی۔

"خوبصورت ہے بہو۔ گھر کا سنگار ہے۔" اسے مونہہ دکھائی کے روپے دیتے وقت گوپال کی طائی کہہ رہی تھی۔

اور گوپال سوچ رہا تھا۔ جب لوگ دروازے کے سامنے کوئی بھینس لا کر باندھتے ہیں تب بھی یہی بات کہتے ہیں۔ "بھینس تو گھر کا سنگار ہوتی ہے۔" اور جب لوگ ڈولی لیکر آتے ہیں تب بھی یہی بات کہتے ہیں۔ "بہو تو گھر کا سنگار ہوتی ہے" اور پھر بھینس اور بہو میں جو فرق ہوا وہ کہاں گیا؟ اور پھر گوپال خود ہی ہنس دیتا۔ "یہ بھی وہی فرق ہے جو ایک عاشق اور ایک دولہا میں ہوتا ہے۔"

گوپال کی بیوی نہ اتنی خوبصورت تھی اور نہ ہی اتنی بدصورت عام طور سے جیسی لڑکیاں ہوا کرتی ہیں۔ دیکھنے میں بس ٹھیک ہی لگتی تھی اور گوپال اسے کبھی "رنگوں کا اشتہار" نہ کہتا تھا اور وہ سہاگ کی چوڑیاں اور جہیز کے کپڑے سب کچھ ایک ساتھ پہن لیتی۔ گوپال اسے کبھی "زیورات کی دوکان" کا طعنہ نہ دیتا۔

آجکل گوپال کی جوانی کے شروع دنوں میں پڑھا ہوا ایک انگریزی ناول یاد آیا کرتا تھا۔ جس میں اپنے خوابوں کی لڑکی تلاش کرنے کے لئے شاہر عمر لگا دیتا ہے۔ مگر اسے تلاش نہیں کر سکتا۔ اور پھر مرتے وقت اپنے بیٹے کو اپنے تمام تصور اور اپنی تمام لگن دے کر وصیت کر جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی آنکھوں والی، اس قسم کے ناک نقشے والی، اور اس قسم کے بالوں والی لڑکی کو ضرور تلاش کرے، اور تما عمر

تلاش کرنے کے بعد اس کا بیٹا مرتے وقت یہی بات اپنے بیٹے کو وصیت کر جاتا۔
"زلف کر سر کرنے میں غالب نے تو صرف ایک ہی عمر کا اندازہ لگایا تھا" مگر گوپال سوچتا' زندگی کی شکست غالب کے اندازہ سے بہت بڑی ہے۔
اور آج کل گوپال سوچ رہا تھا' اس کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوگا۔ ہو بہو اس کی شکل۔ ہو بہو اس کے سپنے اور پھر اس کا لڑکا جوان ہوگا وہ ایک لال مرچ جیسی لڑکی ضرور تلاش کرے گا۔ اور پھر وہ تمام دنیا کو اپنے بیٹے کی آنکھوں سے دیکھے گا۔
"آج میں برف والا پانی نہیں پیوں گی۔" ایک روز گوپال کی بہو نے شکنجبین کا گلاس اپنی ساس کو واپس کرتے ہوئے کہا۔ اور ماں جب اس کے لئے چائے بنانے رسوئی گھر میں گئی تو گوپال نے اپنی بہو سے ہلکا سا مذاق کیا۔ "میں تمام مہینے سپنے جمع کرتا ہوں۔ اور تم مہینے کے آخر میں سارے سپنے توڑ دیتی ہو۔"
شاید انہیں الفاظ کا اثر تھا کہ اگلے مہینے گوپال کی بہو کو دن لگ گئے اور گوپال کی بانہوں میں جیسے ابھی سے اس کا بیٹا کھیلنے لگا۔
"کھٹی یا نمکین چیز تو مانگتی ہی نہیں۔ ہمیشہ اس کا دل میٹھی چیزوں کے لئے مچلتا ہے۔ ضرور بیٹا ہوگا۔ تمہارے پیدا ہونے کے وقت مجھے بھی گڑ کی کھیر اچھی لگتی تھی۔" ماں جب کہتی گوپال کو لگتا اب تو اس کا بیٹا توتلی باتیں کرنے لگ گیا ہے۔
یہ نو مہینے گوپال کو پچھلے نو سال کی طرح معلوم دیئے۔ اور پھر گھر میں گھی گڑ اور اجوائن اکھٹی ہونے لگی۔
کمرے کا دروازہ بند کیا ہوا تھا۔ گوپال باہر برآمدے میں بیٹھ کر کاغذ قلم اور ایک کتاب اپنے سامنے اس طرح رکھی ہوئی تھی جس سے دیکھنے والے کو لگے گویا اسے سر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی۔ مگر گوپال کتاب کا کبھی کوئی ورق الٹتا کبھی کوئی۔ اور پھر جو صفحہ سامنے آجاتا اس کو ہی کاغذ پر نقل کرنے لگتا۔
دروازے کے پاس وہ جم کر بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کے کان اندر کی آواز سننے کے لئے کھڑے تھے۔ اور گوپال انتظار کر رہا تھا۔ ابھی ابھی دائی کہے گی "لاکھ لاکھ

مبارکبادیاں' گوپال کی ماں.... یہ لو بیٹا------"

ایک مرتبہ دائی باہر آئی بھی تھی- کہنے لگی- "بیٹا گوپال ذرا جاکر تھوڑا شہد تو لا دے دیکھ کر لانا شہد نیا ہو-

گوپال وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا- کیا پتہ اس کے پیچھے..... جلدی ہی کچھ ہو جائے..... میں اس کی پہلی آواز سنوں گا- یہ سوچ کر اس نے دائی کو ڈانٹا- "شہد کی یاد اب تمہیں آئی ہے- یہ تمام کام پڑا ہوا ہے میرے سامنے- کل مجھے یہ کام دفتر میں دینا ہے-"

"تم مردوں کو تو اپنے کام کی پڑی رہتی ہے- آخر بوڑھی عمر ہے- کئی باتیں بھول جاتی ہوں-"

دائی یہ کہہ ہی رہی تھی کہ گوپال کی ماں نے مشکل حل کردی- کہنے لگی----- "ہمارے یہاں کبھی کسی نے شہد وہد نہیں دیا- ہم تو انگلی پر تھوڑا سا گڑ لگا کر مونہہ میں ڈال دیتے ہیں-"

"اچھا گڑ ہی سہی-" اور دائی اندر چلی گئی' تھی-

گوپال کے کان پھر دروازے کی طرف لگے ہوئے تھے اور اچانک بچے کے رونے کی آواز آئی- گوپال کا سانس جیسے کسی نے ہاتھ میں پکڑ لیا ہوں- وہ نہ نیچے آرہا تھا اور نہ اوپر جا رہا تھا----- اور ابھی تک دائی کی آواز نہیں آتی تھی- اسے بچے کی آواز کی نسبت دائی کی آواز کا زیادہ انتظار تھا-

اور پھر دائی کی آواز "لڑکی"

گوپال کی کرسی کانپ گئی- اس کی ماں شاید پانی تولیہ لینے باہر آئی ہوئی تھی- گوپال کے ہونٹ کانپے "ماں لڑکی"

"نہیں بیٹا نہیں' تو بھی پاگل ہے- دائیاں یہی کہتی ہیں- اگر یہ کہہ دیں کہ بیٹا ہوا ہے تو زیادہ خوشی کی وجہ سے بہو کی جان کا خطرہ ہے-" اور جلدی جلدی اندر چلی گئی- گوپال کی کرسی اب پہلے کی نسبت اتنی ہی کانپ رہی تھی- مگر پھر بھی گوپال نے اسے دیوار کے سہارے لگا دیا تھا- "بیٹی ہو یا بیٹا جو بھی ہو قسمت والا ہو-"

دائی کی آواز آئی۔

"بیٹی تو لکشمی ہوتی ہے۔ اس مرتبہ بیٹی تو دوسرے سال بیٹا۔" ماں دائی سے کہہ رہی تھی۔

"لڑکی ہے کہ ریشم کا دھاگا ہے....." ماں کہہ رہی تھی یا دائی کہہ رہی تھی۔ اس مرتبہ گوپال سے آواز نہیں پہچانی گئی۔ اس کی کرسی کانپی اور کرسی کی وجہ سے ساری دیوار ہل گئی۔ اسے محسوس ہوا وہ بوڑھا ہوگیا تھا۔ لالہ گوپال داس اور اس کی بیوی اپنے گھٹنوں کو دباتی ہوئی کہہ رہی تھی "لڑکی اتنی بڑی ہوگئی ہے۔ کوئی لڑکا دیکھو نا۔ کہاں چھپاؤں اس آنچل کی آگ کو؟ ایسا روپ..... اوپر سے زمانہ برا ہے۔"

اور پھر جیسے اس کے دروازے پر بارات آگئی۔ اس کے داماد نے اس کے پاؤں چھوئے۔ اس کی بیٹی کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ ڈولی کے پاس جاکر اسے دلاسہ دینے لگا..... اس کی بیٹی..... بالکل لال مرچ.....

لال مرچ..... لڑکی..... لال مرچ..... اور گوپال کو محسوس ہوا آج..... کسی نے مرچیں اٹھاکر اس کی آنکھوں میں جھونک دی تھیں۔